قیمت : -/10 روپے

مارچ 2009

اردو دنیا

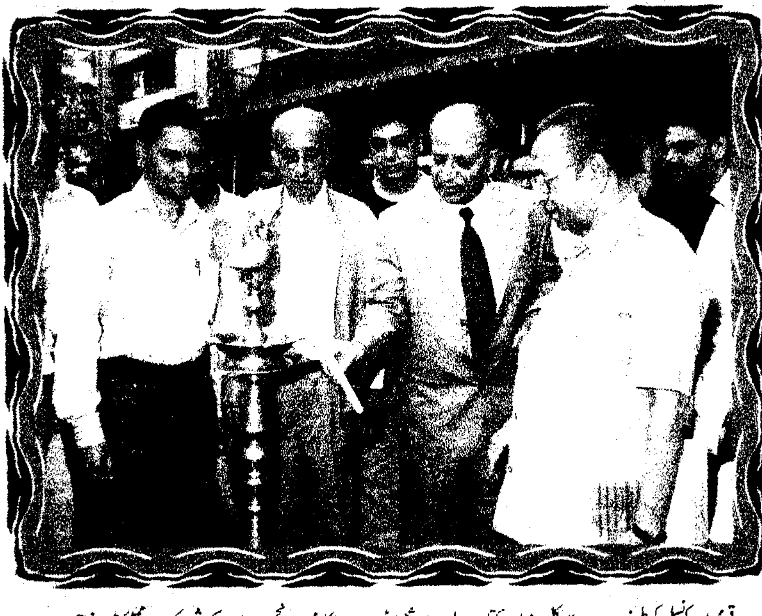

قومی اردو کونسل کی طرف سے دسواں کل ہند اردو کتاب میلہ، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی اور انجمن اسلام کے اشتراک سے ممبئی میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے شمع روشن کرکے میلے کا افتتاح کیا۔ تصویر میں پروفیسر عبدالستار دلوی، جناب ندا فاضلی اور ڈاکٹر ابوبکر عباد بھی نمایاں ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

اردو کتاب میلے کے دوران میں روزانہ ادبی اور ثقافتی پروگرام بھی ہوئے۔ ایک پروگرام میں اسٹیج پر تشریف فرما ہیں (دائیں سے) جناب زماں حبیب، پروفیسر صاحب علی،

جناب ساجد رشید اور کونسل کے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد

میلے کے ایک بک اسٹال پر مشہور سماجی اور فلمی شخصیت جناب فاروق شیخ کتابیں دیکھتے ہوئے۔

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد-11، شمارہ-3، مارچ 2009

مدیر: ڈاکٹر ابوبکر عباد

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر، محمد مشہود عالم، بہلول احمد

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپئے، سالانہ -/100 روپئے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103938، 26103381
فیکس: 26179657، 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26169416، 26109746

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات ...... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات ...... ادارہ 5

زبان اور تعلیم
- اردو زبان — مسائل اور حل ...... امام اعظم 6
- ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اردو ریسرچ ...... خوشحال زیدی 9
- اردو ہے جس کا نام ...... سلمان غازی 12

ادب
- جمیل مظہری کی مثنوی — آب و سراب ...... عاصم شہنواز شبلی 14
- پارسی تھیٹر کا شاہکار ڈراما — لیل و نہار ...... راجیش مسرا 18
- ناصر کاظمی کی غزلیہ شاعری ...... محمد ارشد 22
- احمد یوسف کا افسانہ — 23 گھنٹے کا شہر ...... احمد صغیر 25

سائنس اور معاشیات
- سائنس اور انسانی زندگی ...... اقبال محی الدین 27
- بین الاقوامی تجارتی تنظیم اور ہندوستان ...... سید اطہر رضا بلگرامی 30

کیریئر
- مینجمنٹ اپنی نیوز شیٹ ...... ایم نسیم اعظمی 33

روبرو
- مرزا خلیل احمد بیگ سے گفتگو ...... وحید الحق 35

ہماری مطبوعات سے
- گاؤں میں تعلیم کا رول ...... خواجہ غلام السیدین 41
- محقق کے اوصاف ...... گیان چند جین 44

اردو خبرنامہ ...... ادارہ 47

تبصرہ و تعارف 65
- اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ...... فیاض احمد وجیہہ
- تحقیق کا فن ...... معید رشیدی
- تنقید (ششماہی) ...... ابوبکر عباد
- دھوپ کے پودے ...... عطا عابدی
- ہم سخن فہم ہیں ...... شاہد الاسلام
- گل نا آشنا ...... خان احمد فاروق
- دیگر موصولہ کتب ...... ادارہ

بچوں کا گوشہ
- اٹھو، اٹھو، سویرا ہو گیا ...... عبدالرحیم نشتر 73
- نوبل انعام پانے والے ہندوستانی ...... محمد عبداللطیف 75

آپ کی بات

■ **محمد جلال الدین، ادارہ تہذیب الاخلاق و نشانات، شبلی روڈ، اے ایم یو علی گڑھ**

''اردو دنیا'' فروری کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق جاذب نظر ہے۔ اس کے مشمولات پر اظہار خیال کرنے سے قبل محترمہ رشمی چودھری میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔ ان کی ادارت میں ہم توقع کرتے ہیں کہ رسالہ خوب سے خوب تر کی راہ پر گامزن ہوگا۔ ''اردو دنیا'' کے مشمولات بالعموم بہت جامع اور فکر آمیز ہوتے ہیں اور قارئین کو غور و تامل کی دعوت دیتے ہیں۔ اس رسالے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں نہ صرف ادب پر بلکہ مختلف علوم و فنون پر مضامین شائع ہوتے ہیں جن سے قارئین کو ہر قسم کے علوم سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ فروری کا شمارہ بعض لحاظ سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ''ہماری بات'' کے تحت اداریے میں جن مسائل کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے وہ لمحۂ فکریہ عطا کرتے ہیں۔ بالخصوص عالمی مسائل پر مبنی آپ کی بات فکر و عمل کی نئی راہیں کھولتی ہے۔ آج جب ہم عالمی منظرنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بہت حوصلہ افزا صورت نظر نہیں آتی۔ فسطائی طاقتوں کی حاکمانہ تنگ نظری اور سامراجی تکبر نے پوری دنیا کو آتش فشاں کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ان کی توسیع پسندی اور جابرانہ عزائم نے امن و آشتی کے امکانات کو معدوم کر دیا ہے، ہر طرف مطلق العنانی اور بے دادگری کی فضا چھائی ہوئی ہے، جو ایک مہذب دنیا کی پیشانی پر بدنما داغ ہے۔

ایسے میں انصاف اور مساوات کی باتیں یادِ ایام گذشتہ معلوم ہوتی ہیں۔ انسانیت، مادیت اور استعماریت کی زد میں ہے۔ آدمیت کا احترام اور رشتوں کا تقدس اپنی معنویت کھوتے جا رہے ہیں۔ تہذیبی اور اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ اس تناظر میں آپ کے اداریے کی معنویت مزید بڑھ جاتی ہے۔ گذشتہ شمارے میں مجتبیٰ حسین کے اس خیال کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صارفیت نے گلوبل ولیج میں اشیائے تعیش کی قیمت تو ضرور بڑھا دی ہے لیکن انسان کی قیمت دن بہ دن گھٹتی جا رہی ہے۔ اس سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کے سارے براعظم سمٹ کر ایک گلوبل ولیج میں تبدیل ہو گئے ہیں، لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ انسان کے بیچ کی دوریاں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں، جن کو دور کرنے کی ہنوز کوئی موثر کوشش نظر نہیں آتی۔ اس پس منظر میں مدیر کی یہ رائے بے حد اہم ہے کہ، ایک غیر جانبدار بلاک کا قیام آج پہلے سے زیادہ ضروری ہے۔ اور اس کے لیے بہر صورت بارش کے پہلے قطرے کی مانند ایک بار پھر کسی نہ کسی کو تو پہل کرنی ہی ہوگی۔

مرزا خلیل احمد بیگ کا مضمون ''اسلوبیات کی افہام و تفہیم'' بہت پسند آیا۔ اسلوبیات اور لسانیات کے مابین رشتے سے بحث کرتے ہوئے اسلوبیات کے بارے میں انھوں نے بہت مدلل اور جامع گفتگو کی ہے، نیز اس نوع کے مطالعات کی مختلف سطحوں یعنی لفظیات، صوتیات، معنیات اور نحویات کا بڑی باریکی سے جائزہ لیا ہے اور صوتی سطح پر اسلوبیاتی طریق کار کو واضح کیا ہے۔ یہ مضمون ہماری ادبی معلومات میں گراں قدر اضافہ کرتا ہے۔

''یادِ رفتگاں'' کے عنوان کے تحت لکھے گئے رفعت سروش اور عادل منصوری پر مضامین بہت مفید اور پر مغز ہیں۔ عادل منصوری، رفعت سروش اور فضا ابن فیضی جیسے قادر الکلام شعرا کی رحلت سے اردو دنیا میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے، اور ان کی کمی ادبی حلقے میں کافی عرصے تک محسوس کی جائے گی۔ ضرورت ہے کہ ''اردو دنیا'' ان کے ادبی و شعری کمالات کے اعتراف میں علاحدہ علاحدہ گوشے شائع کرے جو ان کو ایک سچا خراج تحسین ہوگا۔

''اردو خبرنامہ'' کا گوشہ حسب توقع بہت مفید اور معلومات سے بھرپور ہے جو ہمیں اردو دنیا میں رونما ہونے والے تمام تغیرات اور سرگرمیوں سے متعارف کراتا ہے۔ سردست ''اردو دنیا'' علم و ادب کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے، اسی لیے یہ دوسرے رسالوں میں اہم اور نمایاں ہے۔

■ **فیروز عالم، لکچرار اردو، نظامت فاصلاتی تعلیم، MANUU، حیدرآباد**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ ہمیشہ کی طرح ایک نئی آن بان اور رنگ و روغن کے ساتھ دستیاب ہوا۔ ''ہماری بات'' سے لے کر ''بچوں کا گوشہ'' تک آپ کے طویل صحافتی تجربے اور گہری نظر کا احساس ہوتا ہے۔ اداریے میں آپ نے کسی کا نام لیے بغیر بڑی اچھی طرح فلسطین کے نہتے عوام کے قتل عام اور عالمی برادری کی مصلحت آمیز خاموشی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آج وقت کی ضرورت ہے کہ ہمارے وطن کو ایک غیر جانبدار ملک کے طور پر Non-alignment تحریک کو فروغ دینا چاہیے اور ایک قطبی دنیا میں ہم خیال اور جمہوریت پسند ممالک کو ساتھ لے کر ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانا چاہیے۔ اسلحوں کے سوداگروں سے نہ دوستی اچھی نہ دشمنی اچھی۔

''یادِ رفتگان'' کے تحت محترم رفعت سروش، عادل منصوری اور بنت ساجدہ پر مضامین بہت اچھے ہیں۔ رفعت سروش پر مظہر امام صاحب کا تاثراتی مضمون

ان کی ہمہ جہت شخصیت کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔ اردو رسائل کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ رفعت سروش کتنے لکھاڑ تھے۔ چھیاسی برس کی عمر میں بھی وہ اتنے فعال تھے کہ رشک آتا تھا، ہم جوان لوگ ان کے جوش و جذبے اور کام کرنے کی صلاحیت سے مرعوب رہا کرتے تھے۔ گذشتہ پچاس ساٹھ برس کے ادبی منظرنامے میں جو بھی نشیب و فراز آئے وہ سب ان کے حافظے کا حصہ تھے۔ ہم لوگوں کو اس عرصے کے کسی بھی شاعر اور ادیب کے بارے میں جاننا ہوتا تھا تو بلا جھجک انھیں ہی فون کرلیا کرتے تھے۔ وہ زندہ تھے تو ہم لوگ سوچتے تھے کہ سروش صاحب کتنا لکھتے ہیں۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اب ان کی جگہ کون لے گا۔ نہ جانے کس مصلحت کے تحت آپ نے اپنا مضمون زینت آپا پر لکھے گئے مضمون کے بعد دیا ہے حالانکہ بہتر یہ ہوتا کہ رفعت سروش صاحب پر دونوں مضامین ایک ساتھ دیے جاتے۔ ایک کمی اور بھی محسوس ہوئی۔ اس شمارے میں جن شخصیات پر مضامین دیے گئے ہیں ان کی چند تحریریں بھی شامل اشاعت کرلی جاتیں تو بہتر تھا۔ مجھے ''اردو دنیا'' کے صفحات کی تنگ دامانی کا اندازہ ہے لیکن دو تین صفحات کی گنجائش تو نکالی ہی جاسکتی تھی۔

مجتبیٰ حسین صاحب کا مضمون ''ٹیکساس میں اردو کی اساس'' جو ان کے حالیہ دورۂ امریکا کی یادگار ہے، پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں ٹیکساس میں اردو کی صورت حال سے واقف کرانے کے ساتھ انھوں نے وہاں کے چند مقامات سے بھی اپنے مخصوص طنزیہ و مزاحیہ لہجے میں بخوبی واقف کرایا ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ صاحب کا مضمون ''اسلوبیات کی افہام و تفہیم'' لائق ستائش ہے۔ انھوں نے اسلوبیات کے موضوع پر معروضی انداز میں جامع گفتگو کی ہے۔ ایسے مضامین تواتر سے شائع کیے جانے چاہئیں۔ یہ طالب علموں کے لیے بھی مفید ہیں اور ہم جیسے قارئین کے لیے بھی۔

''اردو دنیا'' فروری 2009 کے دیگر مشمولات بھی اچھے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کی ادارت میں اس کے معیار میں مسلسل بہتری آتی رہے گی۔ آپ کو اور آپ کے تمام معاونین کو مبارک باد۔

■ شاغل ادیب، 1-4-304/9/3، صدیق نگر، مشیرآباد، حیدرآباد

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ بابت فروری، 2009 باصرہ نواز ہوا۔ اب کی بار آپ کا اداریہ مختصر سہی مگر بہت زیادہ فکر انگیز ہے۔ جدید معاشرے میں ایک واحد عالمی طاقت جو (بجائے خود اندرونی طور پر کھوکھلی ہے) ساری دنیا کو اپنی بربریت اور جارحیت کا نشانہ بنا رہی ہے۔ ''زبان و تعلیم'' کے باب میں ماہر لسانیات مرزا خلیل احمد بیگ کا مضمون ''اسلوبیات کی افہام و تفہیم'' مفید ہے۔ اسے پڑھ کر مرحوم سید محی الدین قادری زور کی یاد ذہن و دل پر چھا گئی۔ لسانیات میں ان کی تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' کو پہلی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے ٹیکساس میں نئی نسل کے تئیں اردو زبان و ادب سے

جس خلوص و محبت کا تذکرہ کیا ہے وہ اردو کے وطن ہندوستان میں مفقود ہے۔ ''ادب و صحافت'' کے باب میں رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ کا مضمون ''معاصر ہندوستانی شاعری اور مہابھارت'' تحقیقی اعتبار سے قابل قدر و ستائش ہے۔ سید علی حیدر نے اپنے مضمون میں قرۃ العین حیدر صاحبہ کے افسانوں میں ان کے نسوانی کرداروں پر ٹوٹنے ہوئے ظلم و استبداد کا فرداً فرداً اچھا جائزہ لیا ہے۔ اس باب میں معصوم مرادآبادی کا مضمون بھی قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ اب کی بار باب ''یادِ رفتگاں'' بھاری ہے۔ سال 2008 جاتے جاتے ہمارے مشاہیر قلمکاروں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ رفعت سروش صرف شاعر ہی نہیں بلکہ جانے پہچانے نثر نگار بھی تھے۔ مظہر امام صاحب نے ان کی شخصیت اور فن پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ وارث علوی نے بھی عادل منصوری مرحوم کو ان کی شاعری کے حوالے سے اچھا خراج پیش کیا ہے۔ طیبہ بیگم صاحبہ کا مضمون ''ڈاکٹر زینت آپا'' پڑھ کر آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ ہاں اس باب میں مخمور سعیدی صاحب نے مرحوم رفعت سروش کی نظم ''آپریشن سے پہلے'' کا جس انداز سے جائزہ لیا ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ اس شمارے کے دوسرے ابواب ''تبصرہ و تعارف'' اور ''بچوں کا گوشہ'' بھی خوب ہیں۔

■ ڈاکٹر محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد، حیدرآباد۔

''اردو دنیا'' جنوری، 2009 کا شمارہ 3 جنوری کو ہدست ہوا۔ 2009 کا یہ پہلا شمارہ کئی ذیلی و تفصیلی کالموں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ''ہماری بات'' میں اردو کے تعلق سے قومی اردو کونسل کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے اور اردو کے تحفظ و ترقی پر زور دیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ اردو کی بقا اور ترویج کے لیے اردو کو روٹی روزی سے مربوط کرنا ہوگا۔ لیکن دوسری زبانوں کے لوگ اپنی زبانوں کی ترقی کے لیے انھیں روزگار سے جوڑنے کی بات نہیں کرتے۔ ویسے دیکھا جائے تو کوئی بھی شخص اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر کے تجارت اور کاروبار میں لگ سکتا ہے، اردو کے قارئین کو بھی آج کی دنیا میں بہت سہولتیں ہیں، پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا کے علاوہ تجارت میں حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اردو والے نئی نسل کو اردو سکھائیں۔ ان کا یہ عمل اردو کو آئندہ صدیوں میں باقی رکھے گا۔ کسی بھی زبان کی بقا کا دار و مدار نئی نسل پر ہوتا ہے۔ اردو ہندوستانی سماج کے تمام طبقات کی زبان ہے، یہ کسی ایک طبقے کی ذاتی میراث نہیں ہے، اس میں پوری ہندوستانی تہذیب و ثقافت رچی بسی ہے۔ کونسل کی جانب سے اردو نصاب کے تعلق سے ورک شاپ منعقد ہوا اور تمام جامعات کے لیے اردو کے یکساں نصاب کو مروج کرنے کی بات کہی جا رہی ہے لیکن اس امر پر بھی غور و فکر کرنا چاہیے کہ ہر مقام کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں اور ہر جگہ کا اردو کا معیار یکساں نہیں۔ قومی نوعیت کے مجوزہ اردو نصاب میں مقامی ضرورتوں اور تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔

■ شہاب اختر، کلا محمد اسٹورس، کپڑا پٹی، جھریا۔ 828111

اردو کے تعلق سے ہماری بات میں کہی گئی باتیں حق ہیں۔ اردو سے روزگار کا تعلق بھی ہو تو اس کے پھیلاؤ میں تیزی آئے گی۔ اردو بھارت کی میراث ہے، اردو قومی یکجہتی کی زبان ہے، اردو تہذیب کی زبان ہے، اردو ترقی کی زبان ہے، اردو شیریں زبان ہے۔ ملک میں فرقہ واریت کو شکست دینے میں اردو بے حد مددگار ہوگی۔ ہمیں اردو زبان کے تعلق سے عوامی بیداری پیدا کرنی ہوگی۔ اردو والوں کا فرض بھی بنتا ہے کہ وہ اپنی زبان کے لیے آگے آئیں۔ اردو کا بازار پیدا کریں۔ اردو کے اخبارات، رسالے، کتابیں خرید کر پڑھیں۔ اردو نے دوسری زبانوں میں بھی اپنی جگہ بنائی ہے لیکن اہم یہ ہے کہ وہ اپنے ہی رسم الخط میں زندہ رہے۔ اردو ملک کی آزادی کی زبان رہی ہے لیکن ملک آزاد ہوتے ہی اردو غلام ہوگئی اور مسلمان ہوگئی۔ اردو کے ساتھ ملک میں جو حق تلفی ہوئی ہے اس کے ذمے دار اردو والے بھی ہیں۔

رفعت سروش ہمارے درمیان نہیں رہے، اللہ جنت نصیب کرے۔ ''اردو دنیا'' کے دسمبر کے شمارے میں دل کا درد انھوں نے بیان کیا۔ لکھتے ہیں ''ہمارے اردو کے اہل قلم کی بدنصیبی یہ ہے کہ تخلیقی کام کرو، اسے لیے لیے پھرو، رسالوں والوں کی چاپلوسی کرو، بھائی دو لفظ چھاپ دو اور پھر سب کو کتاب مفت بھیجو کہ اگر وہ پڑھنے کی زحمت گوارہ کرلیں تو ان کا شکریہ۔'' یہ آج کی سچائی ہے۔ رفعت سروش صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ بیمار پڑ جایئے تو کوئی پرسان حال نہیں۔ اردو کے حوالے سے بیکل اتساہی، مظہر امام، رالف رسل وغیرہ بھی ناامید ہیں لیکن میں ایسے برے حالات میں بھی پر امید ہوں اور سوچتا ہوں شہد جیسی میٹھی یہ زبان ضرور زندہ رہے گی۔ محمد احسن صاحب کا مضمون ''جدید ترقیاتی منظرنامہ اور اردو'' خاصا اہم مضمون ہے۔

■ ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی، ڈومن پورہ، کساری، مئوناتھ بھنجن

ماہنامہ ''اردو دنیا'' بابت نومبر، 2008 پیش نظر ہے، اس شمارے کی سب سے اہم اور خاص چیز آنجہانی رالف رسل کا گوشہ ہے جو مختصر ہونے کے باوجود کافی جامع ہے۔ موصوف نے مغرب میں اردو زبان و ادب کی توسیع و تدریس کے سلسلے میں جو نمایاں اور گرانقدر خدمات انجام دی ہیں وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے وابستہ ان حضرات کے لیے ایک سبق ہے جو اردو کے نام پر لمبی لمبی اور موٹی موٹی رقمیں پانے کے باوجود اردو زبان و ادب کی بنیادی خدمات سے نہ صرف لاپرواہیں بلکہ اپنے بچوں تک کو بھی اردو نہیں پڑھاتے ہیں۔

آنجہانی رالف رسل نے یورپ میں اردو زبان و ادب کی توسیع و تدریس کے سلسلے میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اگر اردو کے پروفیسر، ریڈر، لکچرر اور اساتذہ حضرات اس کا دسواں حصہ بھی انجام دیتے تو شاید ہندوستان میں اردو زبان کی توسیع و تدریس کے بہت سارے مسائل خود بخود حل ہوگئے ہوتے مگر اس زبان کا سب سے بڑا اور افسوسناک المیہ یہی ہے کہ اس زبان کو سب سے زیادہ نقصان اس زبان کے ماننے والوں سے ہی پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے۔

مذکورہ شمارے میں رالف رسل سے متعلق سبھی مضامین بہتر اور معلوماتی ہیں اور خود موصوف کا مضمون ''اردو سیکھنا'' اپنے آپ میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ دیگر مشمولات میں جناب ذاکر فیضی کا ''آگ کا دریا میں دیدوں کے حوالے'' ریحان غنی کا ''ڈاکٹر سید محمود''، حبیب احمد کا ''حبیب تنویر — ایک زندہ داستان'' اور کاشف غزالی کا ''چائے صنعت میں روزگار'' بطور خاص قابل ستائش و توجہ ہیں۔

■ ظہیر حسن ظہیر، نزد مسجد زبیر، مئوناتھ بھنجن، مئو

ماہنامہ ''اردو دنیا'' بابت نومبر، 2008 موصول ہوا۔ رسالہ حسب سابق معیاری ہے۔ تازہ شمارے کے سرورق پر معروف ڈراما نگار حبیب تنویر کی تصویر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ''اردو دنیا'' بطور خاص طلبہ کے لیے کافی مفید ہے جو ان کی ضروریات کے مطابق ہر ماہ بہترین مواد فراہم کرتا ہے۔

مذکورہ شمارے میں شامل سبھی مشمولات خوب ہیں۔ خصوصاً رالف رسل پر گوشہ شائع کر کے آپ نے اپنی اردو دوستی اور ادب نوازی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس کے لیے آپ لائق مبارک باد ہیں۔ رالف رسل کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کا اردو جیسی غریب الوطن زبان کے لیے تگ و دو کرنا اس کا ثبوت ہے کہ انھیں اس اردو زبان سے کتنی محبت تھی۔ رالف رسل کی زندگی سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہیے جو اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں۔ رالف رسل جن کی مادری زبان انگریزی تھی اور وہ نسلاً بھی انگریز تھے ان کی اردو زبان سے محبت یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ زبان جو بھی اپناتا ہے وہ اس کی ہو جاتی ہے۔

مضامین میں بیگ احساس کا مضمون ''افسانہ اور انشائیہ کے حدود'' کافی معلوماتی ہے۔ اس کے علاوہ ابوبکر عباد کا مضمون ''رالف رسل کی خودنوشت جو بندہ یا بندہ ایک تاثراتی جائزہ'' مختصر ہوتے ہوئے بھی جامع ہے۔

■ حنیف نجمی، دوھری، چھتیس گڑھ

''اردو دنیا'' بابت اکتوبر، 2008 میں پروفیسر لطف الرحمٰن نے اپنے مضمون ''احمد فراز کی شعریات'' میں فراز کے تخلیقی تخیل کو بیدل، اقبال اور فیض کی جمالیاتی وراثت سے ہم رشتہ قرار دیا ہے اور اپنے دعوے کی دلیل میں (بہ خیال خویش) انھوں نے بیدل کے دو شعر پیش کیے ہیں، ان میں سے ایک شعر یہ ہے:

با اضطراب دل زہر اندیشہ فارغم
آسا کشے ست جنبش ایں گاہوارہ را

''ہماری زبان'' (احمد فراز نمبر) میں بھی یہ شعر بیدل کے نام سے نقل ہوا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ یہ شعر غالب کا ہے۔ ''کلیات غالب'' (فارسی) مرتبہ امیر حسن نورانی میں صفحہ 54 پر یہ شعر درج ہے۔ دوسرے مصرعے میں ''فارغم'' ہے ''فارغم'' نہیں۔ غالب نے یہی بات اپنے ایک اردو شعر میں بھی کہی ہے:

شاخ گل جنبش میں ہے گہوارہ آسا ہر نفس
طفل شوخ غنچہ گل بس کہ ہے وحشی مزاج

□□□

ہماری بات

کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو ملک وقوم کی زندگی پر دور رس اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ان کے کاموں کا جائزہ اس اعتبار سے لینا چاہیے کہ ان میں سے کسی نے اپنی قوم کی زندگی پر جو اثرات مرتب کیے وہ مثبت تھے یا منفی۔ اگر اس کے مرتب کردہ اثرات منفی ہیں تو اس کے کاموں کی نفی ضروری ہے لیکن اگر اس کے اثرات مثبت طور پر ظاہر ہوئے ہیں تو اس کے کاموں کی بھی قدر کی جانی چاہیے اور اس کی شخصیت کا بھی احترام کیا جانا چاہیے۔ نجی زندگی میں کسی کے کیا مشاغل تھے، خوردونوش کی کیا ترجیحات تھیں، سونے جاگنے کے کیا اوقات تھے، یہ باتیں چنداں اہم نہیں، اصل اہمیت اس کے ان اعمال وافعال کی ہے جن کے اثرات ملک وقوم کی اجتماعی زندگی کی فلاح و بہبود میں معاون ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے دور کی اہم ترین شخصیتوں میں بھی ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کی ولادت ایک دینی گھرانے میں ہوئی تھی اور ان کی تعلیم وتربیت بھی اسی ماحول میں ہوئی اس لیے دینی حمیت کا جذبہ ان کے رگ وریشے میں سمایا ہوا تھا۔ جب انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو ان کی رہنما قوت یہی جذبہ تھا۔ اس جذبے کا بھرپور اظہار ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے صفحات پر ہوا لیکن مولانا مذہبی تنگ نظری سے ہمیشہ دور دور رہے۔ دینی حمیت کے ساتھ ساتھ وہ حب وطن کے جذبے سے بھی ابتدا ہی سے سرشار تھے۔ یہ حب وطن کا جذبہ ہی تھا جس نے پچھلی صدی کی پہلی دہائی میں ہی انھیں بنگال کے انقلاب پسندوں کی نظر میں معتبر بنا دیا۔ انقلاب پسندوں کی یہ مختصری جماعت ان ہندو انقلابیوں پر مشتمل تھی جو سرسید کی انگریز دوستی کی وجہ سے مسلمانوں کو شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا آزاد کیسے راسخ قوم پرست تھے اس کا کچھ اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی نیتوں کی طرف سے تذبذب میں مبتلا ان انقلابیوں کی نظر میں معتبر ٹھہرے۔

مولانا آزاد نے استخلاصِ وطن کا بیڑا اس وقت اٹھایا اور وطن پر قابض غیرملکیوں کی مزاحمت پر اس وقت کمربستہ ہوئے جب باباے قوم مہاتما گاندھی ابھی افریقہ کو خیرباد کہہ کر ہندوستان واپس نہیں آئے تھے۔ مولانا آزاد کی اس اولیت کا اعتراف واحترام انڈین نیشنل کانگریس کے سبھی چھوٹے بڑے لیڈروں نے کیا اور قومی معاملات میں ان کی رائے کو ہمیشہ اہمیت دی گئی۔ متحدہ قومیت کے اصول پر مولانا آزاد کا عقیدہ کتنا واضح اور مستحکم تھا، یہ اس سے ظاہر ہے کہ تقسیم وطن کے فیصلے سے انھوں نے اس وقت بھی اتفاق نہیں کیا جب تمام کانگریسی رہنماؤں نے اسے قبول کرلیا تھا۔

ملک کی تقسیم کے بعد آزاد ہندوستان کی تعمیر وترقی کی منصوبہ سازی اور انھیں بروئے کار لانے میں بھی مولانا آزاد شریک رہے۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب وثقافت کے فروغ کے لیے جو اقدامات کیے ان کی بارآوری کا اندازہ ان اداروں کی کارگزاریوں سے کیا جاسکتا ہے جنھیں آج ہم مختلف ناموں سے جانتے پہچانتے ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، کونسل فار اگریکلچر اینڈ سائنٹیفک ریسرچ، کونسل فار میڈیکل ریسرچ، کونسل فار سوشل سائنس ریسرچ، کونسل فار کلچرل ریلیشنز، ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی، سفارتی عملے کو غیرملکی زبانیں سکھانے والا ادارہ یا اس طرح کے دوسرے ادارے ان سب کی داغ بیل مولانا آزاد ہی نے ڈالی اور چند برس کی قلیل مدت میں۔

مولانا آزاد کے علمی کارناموں کی فہرست بھی طویل ہے لیکن اس طویل فہرست سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ''ترجمان القرآن'' پر ہی نظر کی جائے تو مولانا آزاد کی دینی بصیرت، قرآن فہمی اور ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ''ترجمان القرآن'' کی تقریباً ڈھائی جلدیں انھوں نے صرف سورۂ فاتحہ کی تشریح وتفہیم میں صرف کی ہیں۔ اگر یہ تفسیر مکمل ہوگئی ہوتی تو معلوم نہیں کتنی ضخیم جلدوں میں سماتی۔

مولانا آزاد کی نجی زندگی بھی بے داغ رہی ہے اگرچہ گاہ بہ گاہ اسے داغدار بنانے کی سعی لاحاصل بعض لوگ کرتے رہے ہیں۔ اب ایک تازہ شگوفہ یہ چھوڑا گیا ہے کہ مولانا شراب نوشی کے عادی تھے۔ اس پر مختلف لوگوں کا ردعمل بھی سامنے آیا ہے۔ معروف عالم دین مولانا وحیدالدین خاں نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ کسی شخص کے کام پر تو رائے زنی کی جاسکتی ہے، اس کی شخصیت پر کیچڑ اچھالنا غلط ہے۔ یہ غیر اسلامی ہی نہیں، غیر اخلاقی اور غیرانسانی فعل بھی ہے۔

مولانا آزاد اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اگر ان میں کچھ انسانی کمزوریاں تھیں تو وہ ان کے ساتھ گئیں، ان کی ان مفروضہ کمزوریوں کا علم کتنے لوگوں کو ہوسکا، اب انھیں بزعم خود ڈھونڈ نکالنا اور مشتہر کرنا، اپنی منفی ذہنیت کا اعلان کرنا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ مولانا کے علمی اور عملی کارناموں کو سمجھا اور پرکھا جائے اور توفیق ہو تو ان سے اکتسابِ فیض کی کوشش کی جائے۔

□□□

امام اعظم

اردو زبان — مسائل اور حل

اردو زبان کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ ایسے مواقع پر ہم جذباتی ہو جاتے ہیں اور چند مسلمات بیان کر کے خوش ہو لیتے ہیں، بلکہ یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ اپنی نارسائی کی تسکین خوش فہمیوں سے کرتے ہیں۔ بجائے حالات و مسائل کے تجزیے کے چند روشن امکانات کی پیش بینی کر کے یا حکومت کو مورد الزام ٹھہرا کر اپنی ذمے داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور مسائل پیدا کرنے والے اسباب وعوامل سے آنکھیں چراتے ہیں۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ملکی اور عالمی تناظر میں اردو اور اس کے مسائل کا جائزہ لیں اور اپنے موقف کو زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ جو علم، زبان یا قوم زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہوسکی وہ زوال آمادہ ہوئی یہاں تک کہ اس کا وجود بھی ختم ہو گیا۔ ایک رپورٹ کے مطابق روزانہ 50 سے زائد زبانیں مرتی جارہی ہیں۔

زندگی کے بے شمار تقاضے ہیں اور ہر تقاضے کے الگ مسائل ہیں۔ دبستانوں سے دانش گاہوں تک اور آغوش مادر سے گھر بازار تک جہاں جہاں ہمارے معاملات ہیں وہاں ہماری زبان کے مسائل ہیں۔ ان مسائل کو ہم مندرجہ ذیل زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

تقریر و تحریر کے مسائل: اردو بحیثیت زبان کہاں تک ہمارا ساتھ دے رہی ہے؟ کہاں تک ساتھ دے سکتی ہے؟ اور کہاں جا کر ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے؟ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

اردو ہمارے گھروں میں رابطے کی زبان ہے۔ ہمارے معاشرے کا ایک بڑا طبقہ علمی پسماندگی کا شکار ہے۔ وہاں یہ زبان رائج ہے لیکن اس کی خوبیوں کے ساتھ اسے اپنانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ سرکاری اسکولوں کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ سیکنڈری سطح تک اردو داں بچوں کا، ڈراپ آؤٹ سب سے زیادہ ہے۔ دوسرا طبقہ ان کا ہے اعلیٰ تعلیم جن کی نظروں کو خیرہ کر رہی ہے اور دولت جن کے لیے حاصل حیات ہے۔ یہ طبقہ اردو چھوڑنے پر آمادہ اور اس کوشش میں مصروف ہے کہ بچے اچھی انگریزی بولیں، یہاں اردو پس ماندگی کی علامت اور انگریزی باعث افتخار ہے۔ تیسرا متوسط طبقہ ہے جس کا ایک حصہ اپنے عجز کی بنا پر انگریزی نہیں بول سکتا مگر اس کی بول چال کی زبان پر Lingua Franca کا غلبہ ہے۔ ''میرے Backbone میں Pain ہے'' جیسی زبان یہاں استعمال ہوتی ہے۔ ان گھروں میں یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ بچے با محاورہ اور فصیح اردو بولیں۔

بول چال کی سطح پر فلمی گانوں کے کچھ اثرات ضرور پڑتے ہیں، لیکن خود فلم کی زبان جو کبھی اچھی اردو ہوا کرتی تھی اب Lingua Franca کا شکار ہے۔

حکومت اور لسانی پالیسیوں سے متعلق مسائل: زبان کی اچھی ترقی میں حکومتیں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اردو کے ساتھ حکومتوں کا رویہ بالعموم سوتیلے پن کا رہا ہے لیکن زندہ قومیں سہاروں پر نہیں جیتی ہیں بلکہ بلند ہمتی سے نامساعد حالات کو سازگار بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔

ہندوستان میں لسانی منافرت کی بنیاد انگریزوں نے ڈالی تھی لیکن اس کی آبیاری ملک کی تقسیم کے بعد خوب ہوئی۔ کوٹھاری کمیشن نے ملکی پیمانے پر یکساں تعلیمی نصاب تیار کرنے کی بات کہی تو اس کو مذہبی اداروں نے مسترد کر دیا اور کوئی نیا فارمولا سامنے نہیں آیا۔ اردو زبان میں بنیادی تعلیم دینے کا سلسلہ 1947 کے بعد بیشتر علاقوں میں بند ہو گیا۔ ہندوستان کے آئین کی دفعہ 29 (1) میں تمام ہندوستانیوں کو اپنی زبان، رسم الخط اور تہذیب کی حفاظت کا حق دیا گیا ہے، پر حکومتیں اس بنیاد پر لسانی پالیسیاں ضرور تشکیل دیتی ہیں مگر ان پر عمل کا جائزہ لیا جائے تو مایوسی ہوتی ہے۔ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے اس بنیاد پر بعض مراعات بھی ملی ہوئی ہیں لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس وقت یہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں اردو اساتذہ کی اسامیاں خالی پڑی ہوئی ہیں بلکہ بہت سی جگہوں پر ان کی جگہ دوسرے مضامین کے اساتذہ کی تقرری کرلی گئی ہے۔ اتر پردیش میں بھی اردو دوسری سرکاری زبان ہے مگر چہ سات امور کو چھوڑ کر سرکاری کام کاج میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو وہاں سب سے زیادہ کس مپرسی کی شکار ہے۔ عام لوگ ہندی کی طرف مائل ہیں، اسکولوں اور کالجوں میں اردو کے طلبہ کی بے حد کمی ہے۔ مہاراشٹر اور کشمیر میں اردو کی حالت بہتر ہے اور اس کے اچھے نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔

سرکاری سرد مہری پر اظہار خیال کرنے سے پہلے ہمیں خود اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم سرکاری مراعات سے کتنا استفادہ کر رہے ہیں۔ دفتروں میں اردو مترجمین سے دوسرے کام لیے جا رہے ہیں کہ ان کے پاس کوئی کام نہیں۔ اوپن اسکولنگ میں اردو ذریعۂ تعلیم سے ایک فی صد داخلہ بھی نہیں ہو رہا ہے۔

یونیورسٹی کی سطح پر بھی اردو میڈیم تعلیم میں سہولیات مہیا ہیں مگر ہمارے طلبہ اس کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

علمی زبان کی حیثیت سے اردو کے مسائل: بلاشبہ ہماری زبان ہر سطح پر ترسیل کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تاہم ایک سوال توجہ طلب ہے کہ عالمی تناظر اور صارفی دور میں اردو کس حد تک ہمارا ساتھ دے سکتی ہے؟ میں یہاں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک ہم علوم کی سطح پر دوسری اقوام کی تقلید کرتے رہیں گے اپنے موضوع پر اچھی مہارت رکھنے کے باوجود دوسرے درجے کی اہلیت کے حقدار ہوں گے۔ لاثانی مہارت ہو تو اور بات ہے۔

یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ ہم اپنی زبان میں ادب کے فروغ کے لیے جس طرح کوشاں رہتے ہیں کیا اسی طرح اپنی زبان میں علوم وفنون کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ ہمارے یہاں ادب کے تعلق سے جس قدر سیمینار اور جلسے ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں علوم وفنون پر ہونے والے سیمیناروں کی تعداد کیا ہے۔ پھر جو سیمینار اس موضوع پر ہوئے ان سے کس حد تک استفادہ ہوا۔ اس ضمن میں غور وفکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو قومیں دنیا میں لسانی برتری رکھتی ہیں انھیں یہ برتری اپنے ادب کی بنیاد پر حاصل ہے یا کسی اور بنیاد پر؟

صحافت کے مسائل: جہاں تک اردو اخبارات وجرائد کا تعلق ہے ہندی اور انگریزی کے بعد اردو تیسرے نمبر پر ہے۔ 1991 میں دو ہزار سے زائد اردو روزنامے تھے لیکن ان کی کل تعداد اشاعت محض 25 لاکھ تھی۔ کسی بھی اخبار کی اشاعت بہ مشکل پچیس ہزار سے تجاوز کرتی ہے۔ اردو زبان کبھی دنیا کی تیسری سب سے بڑی زبان سمجھی جاتی تھی جسے پانچ کروڑ ہندوستانی بولتے تھے۔''

(اردو دنیا اکتوبر 05، بحوالہ ٹائمز آف انڈیا، نئی دہلی 29 جون 05)

یہاں بھی غور وفکر کا پہلو یہ ہے کہ شائع ہونے والے جرائد ومجلات میں علوم وفنون سے تعلق رکھنے والے رسائل وجرائد کتنے ہیں۔ ہمارے عام مجلات میں ان سے متعلق کتنے مضامین ہوتے ہیں۔ ان میں ایسے مشمولات کا معیار کیا ہوتا ہے۔ ان میں بہت سے ترجمے ہوتے ہیں۔ کیا ہمارے مضامین کے ترجمے دوسری زبان والے شائع کرنے پر مجبور ہیں۔ ہمارے جرائد میں بچوں کے ادب کی شمولیت کتنی ہوتی ہے؟ کتابوں کی اشاعت بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں سال میں کتنی کتابیں شائع ہوتی ہیں، ان میں سماجی علوم، سائنس، ریاضی اور قانون وغیرہ سے تعلق رکھنے والی کتابیں کتنی ہیں۔ معیاری تصنیفات وتالیفات پر مختلف اکیڈمیوں اور اداروں سے ملنے والے انعامات واعزازات کی غیر ادبی تخصیصیں کتنی حقدار ہوتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں جو غیر ادبی علمی کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان کا دیگر زبانوں کی ان موضوعات کی کتابوں سے تقابل کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ کم از کم ان کے مساوی کتابیں آسکیں۔

ہمارے یہاں ادب اطفال کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں کتابیں تو کم آہی رہی ہیں رسائل وجرائد بھی خاطر خواہ اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ ہمارے بچوں کو اس عمر میں اگر دوسری زبانوں کی طرف مائل ہونا پڑا تو ظاہر ہے کہ آگے چل کر وہ کیوں کر اپنی زبان کی طرف رجوع کر سکیں گے۔

تدریس کے مسائل: سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ کس سطح تک ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ اعلیٰ تعلیمی سطح تک، اعلیٰ ثانوی تعلیم تک، یا ثانوی تک۔ مادری زبان کے ذریعے تعلیم کی اہمیت مسلم ہے۔

اس سلسلے میں بڑا مسئلہ کتابوں کی فراہمی کا ہے جو کتابیں حکومت کی جانب سے فراہم ہوتی ہیں بالعموم ان کا معیار انگریزی یا دیگر بڑی زبانوں کے برابر نہیں ہوتا ہے۔

جہاں تک اردو ذریعہ تعلیم کا سوال ہے، بہت ساری اصطلاحات جو وضع کی گئی ہیں وہ نامانوس ہیں اور انگریزی اور ہندی کے مقابلے میں ان کا رواج پانا مشکل ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ الگ الگ جگہوں پر ایک ہی انگریزی لفظ کے لیے مختلف اصطلاحات دیکھنے کو ملتی ہیں جس سے بچوں یا بڑوں میں بھی ایک طرح کا تذبذب پیدا ہو جاتا ہے۔ ملک گیر پیمانے پر وضع اصطلاحات کی ایک کمیٹی ہونی چاہیے ووکیشنل اور پروفیشنل کورسیز کے آجانے کے بعد اردو داں طبقہ اس کی طرف بھاگ رہا ہے اس کا کوئی ٹھوس متبادل نہیں ہے اور نہ اس جانب کوئی کوشش ہو رہی ہے۔ ان تمام سطحوں پر مرحلہ وار کمیٹیاں بنا کر مہم چلانے کی ضرورت ہے۔

مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو صورت حال نہایت ہی تشویش ناک ہے۔ ایسی صورت میں تمام اردو اداروں کو ایک کوآرڈی نیشن کمیٹی بھی بنانی چاہیے اور وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے پس منظر میں اردو کو درپیش مسائل کے حل کے لیے سر جوڑ کر کوئی لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے۔ بغیر کوآرڈی نیشن کے یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایک ادارہ ان سارے مسائل کو حل کر دے۔

اردو کی آموزش کے مسائل: ہمارے یہاں غیر اردو دانوں کو اردو سکھانے کا انتظام تشفی بخش نہیں ہے۔ اس طرح کی کتابوں کی بھی بہت کمی ہے اور اس جانب بھی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

اردو کا جادو ہندوپاک سے باہر بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ مغربی اور خلیجی ممالک مثلاً کینیڈا، انگلینڈ، امریکہ، جرمنی، آسٹریلیا، سوئیڈن، دوبئی، جدہ، شارجہ، دوحہ، قطر، ابوظہبی، ریاض وغیرہ میں اردو کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہیں، اخبارات، رسائل وجرائد نکل رہے ہیں۔ کہیں کہیں عالمی سطح کے مشاعرے ہوتے ہیں اور کانفرنسیں ہوتی ہیں اور جدید قلمکاروں کو انعامات سے

بھی نوازا جاتا ہے۔ اس سلسلے کو قائم رکھتے ہوئے یہ بھی ضروری ہے کہ محبان اردو اردو کی بنیادی تعلیم کا مستحکم نظم کریں اور اسے تحریک کی شکل دیں۔ اس بارے میں انھیں بالخصوص اپنے بچوں پر توجہ دینی ہوگی جو اردو کے تعلق سے مستقبل کے معمار ہیں۔ یہ ایک ایسا کام ہے جسے کیے بغیر دوسری کوئی کوشش اردو کے فروغ کے لیے کارگر نہیں ہوگی۔ جب تک ہم اپنے بچوں کو اردو سے آشنا نہیں کرائیں گے ہماری ساری کاوشیں جڑ کو چھوڑ کر شاخوں کو سیراب کرنے کے مترادف ہوں گی۔ ممکن ہو تو مقامی اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا نظم بھی کرائیں۔

ادبی نشستوں اور مشاعروں میں نئی نسل کی شمولیت ضرور ہوتا کہ ماحول سازگار رہے۔ بیت بازی، غزل گائیکی اور قصہ خوانی کی بھی محفلیں منعقد ہونی چاہیے جن سے نئی نسل کی ذہن سازی ممکن ہے۔ اس ضمن میں تقریری اور تحریری مقابلے بھی کارآمد ہوسکتے ہیں۔

اردو تعلیم کے شعبے میں حال کے دنوں میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے کام کیا ہے۔ جو ہندوستان کے علاوہ باہر کی اردو آبادی میں بھی اس کی سرگرمیاں پھیل رہی ہیں اور تعلیم و تدریس کا ایک نظام وجود میں آرہا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور بعض ریاستوں کی اردو اکادمیوں کے ذریعے بھی کوششیں جاری ہیں۔ مانو کے پروگرام "مانو درشن" دوردرشن کے ڈی ڈی ون چینل سے اوپن کلاس روم کی شروعات ہوئی لیکن اس کے مثبت نتائج کا انتظار ہے۔

میں نے مختصراً اردو زبان کے بعض مسائل کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ان مسائل کے حل کے لیے میں اپنی کوششوں کو ایک تحریک کی صورت میں بدلنا ہوگا اور تحریک کی رفتار بے حد تیز کرنی ہوگی۔ اگر عام لوگوں کا رشتہ زبان سے کٹ گیا تو زبان دھیرے دھیرے مرتی چلی جائے گی۔ ہم اگر زندہ ہوں تو ہماری تحریک بھی زندہ ہوگی اور ہماری تہذیب بھی۔ ہمیں ہمارے سارے حقوق مل جائیں گے۔ اپنے طرز عمل کا تنقیدی جائزہ لیے بغیر محض اردو کے روشن امکانات کے نعرے لگاتے رہنے سے اردو کے مسائل حل نہ ہوں گے۔

□□□

پتہ:
Director, Regional Centre
(Maulana Azad National Urdu University)
Super Market, Maula Ganj,
Darbhanga-846004 (Bihar)

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے / مترجم: احسان احمد صدیقی

رام پرشاد نے یہ آپ بیتی گورکھ پور جیل میں اپنی پھانسی 19 دسمبر 1927 کے دو دن قبل مکمل کی تھی۔ رام پرشاد بسمل کے سینے میں جو آگ تھی اور جو مقصد پیش نظر تھا اس کا خلاصہ انھوں نے اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے جس میں ان کی اپنی مفلوک الحال خانگی زندگی، نامساعد ایام، ایام جوانی، ازدواجی زندگی، والدین اور مذہبی و سیاسی تعلیمات کے ساتھ اپنے اندر پیدا ہونے والے حب وطن کے جذبے کی وجوہات، کاکوری ریلوے ڈکیتی، اپنی گرفتاری، جیل کے واقعات، پھانسی کی کوٹھری اور زندگی کے آخری لمحات کی باتیں بڑی دل خراش ہیں۔

صفحات: 109، قیمت: -/33 روپے

جتنے پاس اتنے دور

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا

"جتنے پاس اتنے دور" انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی ہے جو ناول کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب دھیریندر سنگھ جفا نے پہلے انگریزی میں لکھی بعد میں ڈی گھا نے اسے بنگلہ میں ترجمہ کیا، پھر ہندی ترجمہ خود مصنف نے اپنے دوست سید مزمل فدا کے تعاون سے کیا اور اب اردو ترجمہ جناب شاہد جمال نے کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں 1970 سے 1972 تک ہندوستان اور پاکستان کی جنگوں کے توسط سے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں اور کراہوں کو بڑی صفائی اور صدق دلی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے ملک کی حفاظت اور انسانی رواداری کے باب میں ہمارے جذبے اور احساس پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

صفحات: 270، قیمت: -/145 روپے

خوشحال زیدی

ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اردو ریسرچ

"انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند" کی پہلی کانفرنس 1966 میں دہلی میں منعقد ہوئی تھی، اس کے خطبۂ صدارت میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے کہا تھا:

"یہ بات ہمارے لیے اطمینان کا باعث ہے کہ اردو میں تحقیقی کام اب ساری یونیورسٹیوں میں ہو رہا ہے اور اردو زبان اور اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر مختلف یونیورسٹیوں میں جو تحقیقی کام انجام پاچکا ہے، اس کا بڑا حصہ ایسا نہیں ہے کہ جس پر ہم اطمینان کا اظہار نہ کرسکیں۔ تشفی کی بات یہ ہے کہ ہمارے نو عمر اساتذہ اور علما کی تحقیق میں بھی ترتیب دینے کا انتظام اکثر یونیورسٹیوں میں موجود ہے۔ ایک زمانہ تھا جبکہ جدید ہندوستانی زبانوں میں تحقیق کی گنجائش نہیں مانی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے اساتذہ کے ذمے اس خدمت کو کرنے میں یونیورسٹی کو پس و پیش ہوتا تھا لیکن بعض یونیورسٹیوں میں جو تحقیقی کام ہوا ہے اور جو نتائج ہمارے سامنے آچکے ہیں، ان سے اردو زبان پر کم لیکن اردو ادب کے کئی پہلوؤں کے بارے میں اور کچھ انفرادی مصنفین اور شعرا سے متعلق نہایت اہم اور مستند معلومات منظر عام پر آسکی ہیں۔"

پروفیسر عبدالقادر سروری نے اردو کی اعلیٰ تعلیم اور تحقیقی کام کے بارے میں یہ بات 1966 میں کہی تھی۔ 1966 سے تا حال ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں جتنا تحقیقی کام ہوا ہے شاید کسی دوسری زبان میں نہیں ہوا۔

عموماً یونیورسٹیوں میں تین قسم کے مقالے لکھے جارہے ہیں:

1. ایم فل. (M.Phil) ایم.ایڈ (.M.Ed) اور ایم.اے. (.M.A) کی ڈگری کے لیے مختصر تحقیقی مقالے (Dissertation)
2. پی.ایچ.ڈی. (.Ph. D) کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالے
3. ڈی.لٹ (.D.Lit) کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالے

ایم فل.، ایم.ایڈ. اور ایم.اے. کے مقالے مختصر ہوتے ہیں نیز ان مقالوں کی تکمیل کی مدت ایک سال ہوتی ہے۔ پی.ایچ.ڈی. اور ڈی.لٹ کے تحقیقی مقالوں کی تکمیل کی مدت دو سال یا اس سے زائد ہوتی ہے۔ ہندوستان کی تقریباً چالیس یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ تاریخ، تنقید اور تحقیق کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آرہے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یونیورسٹیوں میں جو تحقیقی کام ہو رہا ہے وہ تسلی بخش نہیں۔ قابل قدر تحقیق صرف یونیورسٹیوں سے باہر ہو رہی ہے۔ لیکن کئی بڑے محققین یونیورسٹیوں میں تحقیقی کاموں کی سربراہی کرتے رہے ہیں۔

یونیورسٹیوں میں ہونے والے تحقیقی کام کے معیار کی طرف جو انگشت نمائی کی جارہی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان یونیورسٹیوں کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں، ان کا کوئی مشترکہ پروگرام نہیں۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ:

"ایک ہی موضوع پر دو دو تین تین جگہ کام ہوتا رہتا ہے اور اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک دوسرے کے کام پر چھاپا مارا جاتا رہا ہے یعنی اگر کسی کو معلوم ہوجائے کہ فلاں شخص ایک اہم نسخے پر کام کررہا ہے تو دوسرا اس کی دریافت سے فائدہ اٹھائے گا اور اس کتاب کو اس سے قبل چھاپنے کی کوشش کرے گا۔ صرف تذکروں یا نثری کتابوں میں ہی نہیں دواوین کے سلسلے میں بھی ایسا ہوا ہے۔"(1)

یونیورسٹیوں میں تحقیق کی پست معیاری کا دوسرا سبب "جلد بازی" ہے یعنی جتنی جلد تحقیق مکمل ہوجائے ڈگری حاصل کرنے میں سہولت رہتی ہے۔ گویا اسکالر جو کام کررہا ہے وہ صرف ڈگری کے حصول کے لیے نہ کہ تحقیق کا حق ادا کرنے کے لیے، لیکن ایسا ہر یونیورسٹی میں نہیں ہے۔ بعض یونیورسٹیوں میں قابل قدر کام ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ وہاں کے قابل اساتذہ اپنے تجربات اور صلاحیتوں کو بروئے کار لارہے ہیں۔

ہندوستان کی تقریباً پینتالیس یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں میں تحقیقی کام جاری ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن تحقیقی کاموں کے لیے ریسرچ اسکالرز کو وظائف اور کنٹی جنسی (Contigency) اخراجات دے رہا ہے۔

ریسرچ کا معیار کالج کے دوسرے شعبوں کے معیار سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دور جدید میں ادب اور سائنس کی قیادت مغرب کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری یونیورسٹیاں روس، جرمنی، فرانس اور انگلینڈ کے معیار تک نہیں پہنچی ہیں۔ ہم تو ایشیا کے بعض ممالک کے معیار سے بھی پچھڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً جاپان کی یونیورسٹیاں، ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے بہتر کارکردگی کا

ثبوت دے رہی ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ یونیورسٹیوں میں ایم فل، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے لیے مقالے لکھے جارہے ہیں۔ یہ مقالے واقعاتی (Factual) اور توضیحی (Evaluative) دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔ ان مقالوں کو ہم چھ مختلف گروپوں میں تقسیم کرسکتے ہیں یہ تقسیم تحقیق کے موضوعات کے تحت کی گئی ہے:

1. شخصیاتی مقالے
2. تصنیفی اور تدوینی مقالے
3. لسانیاتی مقالے
4. نظریاتی مقالے
5. علاقائی مقالے
6. صنفی مقالے

1. شخصیاتی مقالے: شخصیاتی مقالے مشہور و معروف ادیبوں اور شاعروں کی حیات اور ان کے کارناموں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ایسے مقالے ہر یونیورسٹی میں سب سے زیادہ لکھے جارہے ہیں۔ لیکن معیار کے اعتبار سے خاطرخواہ کام نہیں ہوا ہے۔ بعض شخصیتوں پر کئی کئی بار کام ہوا ہے جبکہ سیکڑوں ایسے ادیب اور شاعر ہیں جن کی طرف ابھی تک توجہ نہیں کی گئی۔ بقول مالک رام:

"یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمیں ان میں سے بیشتر کی تفصیل تو درکنار اجمالی حالات بھی معلوم نہیں ہیں۔ ان کے متعلق یقین سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہ صورتِ حال بہت افسوسناک ہے۔ جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں بھی غیر متعلق اور تحقیقی رطب و یابس زیادہ ہے اور کام کی باتیں کم۔" (2)

شخصیاتی مقالوں کے معیار کی طرف دھیان دینے کے ساتھ ساتھ یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ جن ادبی اور تاریخی اشخاص پر کام نہیں ہوا ہے ان کی مکمل سوانح عمریاں، ان کے کارناموں کی تفصیل پیش کی جائے۔ ماہرین تعلیم اور سائنس دانوں پر بھی تحقیقی مقالے لکھے جانے چاہیے۔

نئے محققین عام طور پر شخصیاتی مقالوں میں سوانح نگاری کا طریقۂ کار اپناتے ہیں جو عموماً میکانکی انداز لیے ہوتا ہے۔

2. تصنیفی اور تدوینی مقالے: ان مقالوں کا تعلق غیر مطبوعہ یا مطبوعہ شعری یا نثری تصنیفات کی تدوین اور ترتیب یا ان تصانیف کی ادبی اور تہذیبی قدر و قیمت کے تعین سے ہوتا ہے۔ شخصیاتی مقالوں کی طرح ایسے مقالوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ قدیم متون کی ترتیب میں احتیاط بہت ضروری ہے۔ دواوین کے علاوہ اردو کی قدیم نثری کتابوں کے مطبوعہ اور قلمی نسخوں پر کام کرنے کی بڑی گنجائش ہے۔ اردو تذکروں پر بھی ابھی تک تسلی بخش تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔

3. لسانیاتی مقالے: اردو میں لسانیات پر کام بہت کم ہوا ہے۔ لسانیاتی مقالوں کا تعلق علمی اور تاریخی امور سے ہے اور ان کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا محنت طلب ہے۔ شاید اسی لیے اس نوعیت کے مقالے کم لکھے جارہے ہیں۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ:

"اردو لسانیات میں ابھی کام کی ابتدا ہے، اردو صوتیات پر خاصا کام ہوگیا ہے لیکن ابھی اردو کے صرفی و نحوی جائزے کو کسی نے نہیں چھوا۔ اردو بولیوں کے سروے (Survey) کی بھی ضرورت ہے۔"

4. نظریاتی مقالے: ہندوستان میں نظریاتی مقالوں پر خاطرخواہ کام ہوا ہے۔ اس کے باوجود بعض گوشے ابھی تشنہ ہیں۔

5. علاقائی مقالے: علاقائی مقالے وہ مقالے ہیں جن کا تعلق ملک کے ان علمی و ثقافتی مراکز اور علاقوں سے ہے جن کا زبان و ادب کی نشوونما اور ترویج و اشاعت میں اہم حصہ رہا ہے، بہت سے ایسے مقام ہیں جہاں بڑے بڑے ادیب، شاعر، مفکر اور دانشور پیدا ہوئے نیز جن کی ادبی شخصیت کی تعمیر میں اس مقام کے تہذیبی اور تمدنی اثرات دخیل رہے ہیں، ایسے مقامات کی حیثیت ایک "دبستان" کی سی ہے۔ ان پر تحقیقی مقالے لکھنے کی ضرورت ہے۔

6. صنفی مقالے: شخصی مقالوں کی طرح اردو شعروادب کی مختلف اصناف پر بہت سے تحقیقی مقالے لکھے گئے اور لکھے جارہے ہیں۔ غزل، مرثیہ، مثنوی، داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، قطعہ، رباعی، واسوخت، شہرآشوب، نظم، گیت سوانح، ادب لطیف، رپورتاژ اور انشائیے وغیرہ سب ہی اصناف پر مقالے لکھے گئے ہیں لیکن اب بھی بہت سی اصناف تشنہ ہیں۔ مثلاً بچوں کے ادب کی نثری اور شعری کسی بھی صنف پر قابل لحاظ کام نہیں ہوا ہے۔ (3)

یہاں چند موضوعات دیے جارہے ہیں جن پر مختلف یونیورسٹیوں میں کام ہورہا ہے، لیکن ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا۔ یہ فہرست دینے کا مقصد یہ ہے کہ اس کی مدد سے ذہن میں دوسرے سیکڑوں عنوانات پیدا ہوسکتے ہیں۔

چند اہم موضوعات:

1. اردو ہندی شاعری کا تقابلی مطالعہ
2. اردو اور پنجابی کا لسانیاتی رشتہ
3. اردو میں مستعمل انگریزی الفاظ کا تحقیقی مطالعہ
4. اردو ادب پر تقسیم ہند کے اثرات

5. اردو شاعری میں تمثیل نگاری

6. اردو میں مذہبی ادب

7. اردو میں نعتیہ شاعری

8. اردو اور ہندی کے عروض کا تقابلی مطالعہ

9. اردو میں اخلاقی شاعری

10. اردو شاعری میں عورت کا کردار

11. اردو ادب میں سیاسی رجحانات

12. اردو کا حکایتی ادب

13. اردو عروض کا تنقیدی مطالعہ

14. اردو ادب میں سیرت النبیؐ

15. اردو ہجویات

16. دِلّی کالج کی ادبی خدمات

17. گارساں دتاسی کی ادبی خدمات

18. اردو میں رومانوی تحریک

19. اردو میں ایہام گوئی کا دور

20. اردو صحافت کا تدریجی ارتقا

21. اردو افسانہ نگاری پر تقسیم ہند کے اثرات

22. اردو کے علمی اور تصنیفی ادارے

23. اردو کا زندانی ادب

24. اردو میں سنسکرت اور ہندی کے تراجم

25. بیسویں صدی میں دہلی کی اردو صحافت

26. بچوں کے اخبارات و رسائل

27. کلاسیکی ادب کی لغات

28. اردو میں تدریسی ادب

29. اردو میں ادبی تبصروں کی روایت

30. اردو داستان گوئی

ان موضوعات پر متعدد یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام ہو رہے ہیں۔ نئے موضوعات (جن پر تحقیق نہیں ہو رہی) کو بھی تحقیق کا موضوع بنانا چاہیے۔

حواشی:

1. "اردو میں تحقیق کا معیار" (مذاکرہ) مشمولہ "رہبر تحقیق" اردو سوسائٹی، شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، ص-143

2. مالک رام "اردو میں تحقیق" مشمولہ "رہبر تحقیق" اردو سوسائٹی شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، ص-75

3. بچوں کے ادب پر پہلا تحقیقی مقالہ 1989 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ڈاکٹر مظفر حنفی کی زیر نگرانی تیار ہوا۔

□□□

پتہ:
80, Ghaffar Manzil, Street No. 8,
Jamia Nagar, New Delhi-110025

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم و سوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی / مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورّخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاسمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے "اکبرنامہ" کے ساتھ ساتھ ملّا عبدالقادر کی "منتخب التواریخ" (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملّا عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند و ناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو "اکبرنامہ" سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم و سوم 620، قیمت: جلد اوّل-/335 روپے / جلد دوم و سوم-/555 روپے

سلمان غازی

اردو ہے جس کا نام

محترم محسن عثمانی صاحب کی تحریر ''آتی ہے اردو زباں آتے آتے'' کئی ادبی رسائل و اخبارات میں گزری۔ محسن صاحب نے بہت سے الفاظ کے استعمال پر اعتراض کیا ہے جو اردو میں رواج پا چکے ہیں۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں، اردو کئی زبانوں کے اشتراک سے بنی ہے اور افعال کو چھوڑ کر اکثر الفاظ فارسی، عربی، ترکی اور سنسکرت وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔ ان کے اصل معنی اور تلفظ میں اردو والوں کو تصرف کا اختیار ہے یا نہیں اس پر کافی بحث ہو چکی ہے اور اکثریتی رائے سے یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اردو والے اس تصرف کے مجاز ہیں۔ مولانا حالی کے مقدمہ شعر وشاعری سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں:

''اسی طرح جہاں تک استقرا کیا جاتا ہے کسی زبان کے الفاظ دوسری زبان میں جا کر اپنی اصلی وضع پر قائم نہیں رہتے پس جب کہ موسم، یا میت یا نشاط وغیرہ الفاظ ہمارے خاص و عام سب کی زبان پر جاری ہیں تو اردو نظم ونثر میں ان کا کیوں نہ استعمال کیا جائے، بات یہ ہے کہ ایسے لفظوں کو جو عربی اور فارسی یا انگریزی سے اردو میں لیے گئے ہیں اور اصل وضع کے خلاف عموماً استعمال ہوتے ہیں، یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ موجودہ صورت میں عربی یا فارسی یا انگریزی کے الفاظ ہیں، نہیں بلکہ ان کو اردو کے الفاظ سمجھنا چاہیے، جو اصل کے لحاظ سے عربی یا فارسی یا انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ ایسے لفظوں کو غلط سمجھ کر ترک کرنا اور ان کو اصل کے موافق استعمال کرنے پر مجبور کرنا بعینہ ایسی بات ہے کہ لالٹین کو لینٹرن بولنے پر مجبور کیا جائے......''

میں محسن صاحب کی اس رائے سے متفق ہوں کہ اچھی اردو جاننے کے لیے تھوڑی سی فارسی دانی اور عربی دانی بھی ضروری ہے لیکن مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب بعض حضرات ان زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کے بعد صرف انھی زبانوں کے اصولوں کا اطلاق اردو میں مستعمل الفاظ پر بھی کرنے لگتے ہیں۔ مولانا حالی کی درج بالا رائے کے مطابق تمام الفاظ جو دوسری زبانوں سے آئے ہیں اب وہ اردو کے ہو گئے اور اب ان پر نہ تو ان زبانوں کے قواعد کا اطلاق ہوگا اور نہ اس زبان کے تلفظ اور معنی کا اعتبار رہے گا جہاں سے وہ آئے ہیں بلکہ اردو والوں نے جس معنی، تلفظ اور محل میں استعمال کیا وہی صحیح ہے۔

زبان میں ہر جگہ منطق نہیں چلا کرتی بلکہ اہلِ زبان کا استعمال سند ہے۔ اکثر الفاظ جب ایک زبان سے دوسری زبان میں جاتے ہیں تو ان کا تلفظ ہی نہیں بلکہ مفہوم تک بدل جاتا ہے۔ یہی نہیں دوسری زبان سے آنے والے الفاظ کا محل استعمال اور تذکیر و تانیث یا جمع یا واحد کا مسئلہ بھی اہل زبان کا استعمال طے کرتا ہے، کوئی قاعدہ یا کلیہ نہیں۔ انگریزی کے بعض الفاظ کی جمع اردو میں ہندی قاعدے سے بنائی گئی ہے جیسے کاریں، کاروں، ٹیملیں، ٹیبلوں وغیرہ جب کہ بعض کی جمع عربی یا فارسی قاعدے سے جیسے نمبر کی جمع نمبرات اور ممبر کی جمع ممبران۔ اسی طرح کوئی یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ اردو میں ٹیمبل، کرسی، مونث کیوں ہیں اور اسٹیشن کس قاعدے سے مذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل زبان کا استعمال ہی یہ چیزیں متعین کرتا ہے۔

محسن صاحب نے ''قاعدے'' کے اعتبار سے خورشید الاسلام اور اختر الواسع ناموں کو بھی غلط قرار دیا ہے کیونکہ ان میں ایک لفظ فارسی اور دوسرا عربی کا ہے، اور انھیں ترکیب دی گئی ہے عربی قائدے سے۔ لیکن جب ہم بات اردو کے تناظر میں کر رہے ہیں تو قاعدہ بھی اردو کا ہی ہونا چاہیے، البتہ فوق البھڑک اور کثیر المھک جیسی جو مثالیں انھوں نے پیش کی ہیں، وہ استثنائی صورتیں ہیں۔ جیسے بعض اردو داں ہندی کی تضحیک کے لیے تفنن طبع کے طور پر کچھ الفاظ وضع کر لیتے ہیں۔ اضافی ترکیب میں مختلف زبانوں کے مضاف اور مضاف الیہ میں تناقص نہیں کیونکہ دونوں الفاظ اردو میں آ کر اردو کے ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے آپ اہلِ زبان کی چھٹی حس یا Intuition کہہ سکتے ہیں کہ وہ غیر زبان سے درآمد الفاظ اسی طرح استعمال کریں گے جو زبان کے مزاج کے مطابق ہو اور صوتی حسن بھی رکھتا ہو۔ زبان پر میرا مطالعہ محدود ہے لیکن ایک بات تو سبھی جانتے ہیں کہ ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے جو اس تہذیب کا عکاس ہوتا ہے جس میں وہ پلتی بڑھتی ہے، دوسری زبان سے الفاظ کی درآمد ہمیشہ مطلوب رہی ہے کیونکہ وہ زبان کی ثروت میں اضافہ کرتی ہے لیکن ان الفاظ کے لیے ان زبانوں کے قواعد کے اطلاق پر اصرار کرنا جہاں سے وہ لیے گئے ہیں نامناسب ہے۔

کسی قاعدے یا قانون کے بجائے اہلِ زبان کا استعمال ہی کسی لفظ کو ترک کرنے یا اس کا مفہوم بدلنے کا سبب بن سکتا ہے حالانکہ وہ صرف ونحو کے اعتبار سے صحیح ہوتا۔ مثال کے طور پر 19 ویں صدی کے آخری عشرے میں مولانا جعفر تھانیسری کو انگریزوں نے کالا پانی کی سزا دی اور انھیں جزائر انڈمان بھیج دیا تھا۔ وہاں کے سفر اور قیام کی دلچسپ داستاں انھوں نے رہائی کے بعد ''تواریخ عجیب عرف کالا پانی'' کے نام سے شائع کروائی تھی۔ انڈمان میں انھوں نے ایک عورت سے شادی کر لی تھی جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں: ''وہاں میں نے ایک

عفت اور نہایت ہی شرمناک عورت کے ساتھ عقد کرلیا۔" لغوی اعتبار سے کسی صفت میں "ناک" کا لاحقہ لگانے سے اسم بن جاتا ہے جیسے: ہیبتناک (ہیبت ناک) یا حیرت ناک۔ (حیرت والی) اس اعتبار سے شرمناک کا مطلب شرم والی ہوگا۔ لیکن اب شرمناک بالکل الگ معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی باعثِ شرم۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ اہلِ زبان نے اسے یہ نیا مفہوم پہنا دیا۔

اسی طرح امالے والے قاعدے سے اسمِ خاص کو بھی بدل دینا صحیح نہیں۔ اور مکہ، مدینہ یا پٹنہ وغیرہ کو امالے کے ساتھ مکے، مدینے یا پٹنے لکھنے پر اصرار کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسمِ خاص کے ساتھ دنیا کی کسی بھی زبان میں بشمول اردو اس بات کی گنجائش نہیں کہ اس میں کسی طرح کا تصرف یا تبدیلی کی جائے خواہ ان کا استعمال کسی بھی شکل میں ہو۔ پھر محسن صاحب نے سند کے طور پر یہ شعر پیش کیا ہے:

کسی کا مجھ کو نہ محتاج رکھ زمانے میں
کمی ہے کون سی یارب ترے خزانے میں

اس شعر میں زمانہ اور خزانہ اسمِ خاص نہیں ہیں اس لیے خزانے اور زمانے ہو گئے۔ یہ مثال ہی غلط ہے۔ کوئی ایسا شعر جس میں کسی نے اسمِ خاص کو اس طرح باندھا ہو وہ پیش کیا جانا چاہیے تھا لیکن اگر ایسا شعر ہو بھی تو اصولی طور پر اس طرح اسمِ خاص کو بدلنا غلط ہوگا۔

لفظ مملوک کے استعمال پر بھی محسن صاحب کو اعتراض ہے۔ شاید ان کے ذہن میں لفظ مشکور نہیں آیا جو اردو میں شکرگزار کے لیے عموماً استعمال ہوتا ہے۔ علامہ شبلی کا مصرعہ ہے:

آپ کے لطف کا ممنون ہوں مشکور ہوں میں

جبکہ عربی میں جہاں سے یہ لفظ آیا ہے وہاں اس کا مفہوم "وہ جس کا شکریہ ادا کیا گیا" ہوتا ہے اور شکرگزار کے لیے لفظ "شاکر" ہے، یہاں بھی مولانا حالی کے بتائے اصول کے مطابق اعتبار اس مفہوم کا ہوگا جو اردو اہلِ زبان نے ان الفاظ کو پہنایا اور جس طرح خواص و عوام نے انھیں برتا ہے۔ یہی بات ناراضگی کے بارے میں کہی جاسکتی ہے کہ "ناراضی" خواہ کسی دوسری زبان کے اصول کے مطابق صحیح ہو اردو میں کوئی استعمال نہیں کرتا، یہاں ناراضگی ہی مستعمل ہے۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اردو میں عربی کے الفاظ کو اصل تلفظ یا معنیٰ میں استعمال نہ کرنے کو عربی زبان پر اردو کا ظلم کہا جائے۔ لیکن یہی ظلم کسی اور زبان کے ساتھ ہو تو وہاں خاموشی اختیار کرلی جائے، جیسے: انگریزی لفظ بور BORE سے اسم مشتق بوریت بے تکلف استعمال ہو رہا ہے۔ لیکن انگریزی قاعدے سے غلط ہے۔ اب اگر کوئی اس پر اصرار کرے کہ انگریزی قاعدے سے ہی اردو میں بھی ہمیں بوریت کی جگہ بورنگ استعمال کرنا چاہیے تو کیا یہ صحیح ہوگا۔ یہی نہیں جب عربی زبان دوسری زبانوں کے الفاظ کے ساتھ یہی سلوک روا رکھتی ہے تو اسے تعریب کہہ کر جائز ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان یا پارکر کو اگر عربی میں باکستان یا بارکر کر دیا گیا تو کہا جائے گا کہ عربی زبان میں "پ" کی آواز ہی نہیں ہے لیکن انگریزی نام "نیویا" جس کے تمام حروف کی آوازیں عربی میں موجود ہیں اسے نیفیا کیوں کیا گیا۔ جب لفظوں کو معرب کیا جاسکتا ہے تو موزد کیوں نہیں؟

اردو زبان میں عربی کے علاوہ دوسری بہت سی زبانوں کے بھی بے شمار الفاظ اپنے اصل تلفظ اور معنی سے مختلف تلفظ اور معنی میں مستعمل ہیں، اصل کے مطابق ان کے استعمال پر اصرار کرنا، اردو کو ایک خود مختار زبان نہ ماننے کے مترادف ہوگا۔

□□□

پتہ:
80, Ghaffar Manzil, Street No. 8,
Jamia Nagar, New Delhi-110025

کلیاتِ راجندر سنگھ بیدی — جلد اول، جلد دوم

مرتب: وارث علوی

کلیاتِ راجندر سنگھ بیدی کی پہلی جلد میں افسانے اور دوسری جلد میں بیدی کے ناولٹ، ڈرامے، مضامین، انشائیے، خاکے، خطبے، دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچے، تبصرے، تاثرات، تنقیدیں اور مختلف ادبی شخصیات کو لکھے گئے 31 خطوط ہیں۔ جلد اول میں مرتب نے راجندر سنگھ بیدی کی زندگی اور شخصیت کے علاوہ بیدی کے افسانوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کے ساتوں مجموعے — دانہ و دام، گرہن، کوکھ جلی، اپنے دکھ مجھے دے دو، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، مکتی بودھ اور اس کے علاوہ بیدی کے وہ افسانے بھی شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں نہیں ہیں۔ دوسری جلد میں ان کے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' اور ان کے ڈراموں کے دونوں مجموعے — بے جان چیزیں اور سات کھیل جن میں گیارہ ڈرامے ہیں۔ اس دوسری جلد میں بیدی کے فن پر وارث علوی کا مضمون ان کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

جلد اول: صفحات: 1040، قیمت: 525 روپے / جلد دوم: صفحات: 655، قیمت: 380 روپے

عاصم شہنواز شبلی

جمیل مظہری کی مثنوی — آب وسراب

جمیل مظہری کا شمار بیسویں صدی کے ان ممتاز شعرا میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی جدتِ طبع، فکری بصیرت، وسعتِ نظر اور زبان و بیان پر غیر معمولی دسترس کی بدولت اردو شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ لہجے کی انفرادیت اور اندازِ بیان کی ندرت کی وجہ سے ان کی آواز دور سے پہچانی جاتی ہے۔ جمیل مظہری نے روایت سے بغاوت کے بغیر اپنی شناخت قائم کی۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور ہر جگہ اپنی شانِ انفرادیت کو برقرار رکھا۔ غزل ہو یا نظم، رباعی ہو یا قطعہ، مرثیہ ہو یا قصیدہ، مثنوی ہو یا ہجو، جمیل مظہری نے ہر صنف کا حق ادا کیا ہے۔

مثنوی ''آب و سراب'' جمیل مظہری کی شعری تخلیقات میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مثنوی کا سال تصنیف 1960 ہے اور 1963 میں علی گڑھ سے نکلنے والے مشہور رسالے ''اردو ادب'' نے پہلی بار اسے شائع کیا تھا۔ اربابِ فکر نے اس مثنوی کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور اسے کتابی صورت میں شائع کرانے کے تقاضے ہونے لگے تو جمیل صاحب کے برادر خورد جناب رضا مظہری نے 1970 میں مکتبۂ ارتقا، کلکتہ سے پوری مثنوی کتابی شکل میں شائع کردی۔

مثنوی ''آب و سراب'' 506 اشعار پر مشتمل ہے۔ اسے شاعر نے 21 حصوں یا 21 بندوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے علاوہ ''اعتراف'' کے عنوان سے بھی 6 اشعار درج ہیں۔ عام طور پر مثنوی نگار داستان کے آغاز سے پہلے حمد، نعت، منقبت وغیرہ پر مشتمل اشعار قلم بند کرتے ہیں۔ جمیل مظہری نے بھی جو چھ اشعار لکھے ہیں، وہ اسی نوعیت کے ہیں اور بلا تخصیص مذہب و ملت انھوں نے بھی اکابر پر سلام بھیجا ہے۔ یہ مثنوی چھوٹی بحر میں لکھی گئی ہے جس کے ارکان مفعول، مفاعلن، فعولن ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ''آب و سراب'' کی تخلیق کی تحریک انھیں پنڈت دیا شنکر نسیم کی شہرۂ آفاق مثنوی ''گلزار نسیم'' سے ملی ہے اور اس مثنوی نے ان کے بچپن سے ہی ان کے ذوقِ سخن کی رہنمائی اور آب یاری کی۔ انھوں نے ''آب وسراب'' کو پنڈت دیا شنکر نسیم کے نام ہی معنون کیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ان کی مثنوی کا موازنہ نسیم کی مثنوی سے کیا جانے لگا۔ بعض لوگوں نے بحر کی یکسانیت کی وجہ سے بھی ''آب و سراب'' کے لب و لہجہ، آہنگ، تشبیہات و محاورات، زورِ بیان، اور منظرکشی کے سرے ''گلزار نسیم'' سے ملا دیے، جب کہ دونوں کے موضوعات مختلف ہیں۔ ایک میں لکھنوی تہذیب اور معاشرے کا عکس ہے تو دوسری میں زندگی کی تلخ اور سچی حقیقت کی عقدہ کشائی کا عمل۔ ایک میں جنوں، پریوں، شہزادوں کی طلسمی حکایتوں کا اظہار ہے تو دوسری میں حیات و کائنات کے مباحث اور مذہب کے مابعد الطبیعیاتی مسائل کا ذکر۔ ایک عشقیہ داستان پر مبنی ہے تو دوسری انسان کی ازل سے تاحال کی داستانِ سفر ہے۔ ''آب وسراب'' میں جمیل صاحب نے مذہب، فلسفہ اور اخلاق کی روشنی میں انسان کی ازلی تشنگی اور کائنات میں اس کی گم شدگی کا اظہار کیا ہے۔ معروف نقاد نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

''جمیل مظہری کی مثنوی اور نسیم کے اشعار میں تشنگی، آب وسراب ان تین چیزوں کے سوا اور کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ جمیل مظہری کی مثنوی کا دائرۂ فکر نسیم کے اشعار سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ بہت وسیع بھی ہے جس میں دنیا کو ہولناک، بے آب و گیاہ اور بے چشمہ و چاہ قرار دیا گیا ہے اور اس کے لیے خدائی ماتم خانہ اور کارگہہ زیاں پرستی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔''

(جمیل مظہری نمبر، ''کائنات''، مرزا پور، 1982، ص: 282)

مثنوی ''آب وسراب'' کے آغاز میں جمیل مظہری انسان کی تاریخی تشنہ لبی کا بیان کرتے ہوئے اپنے ہم سفروں کو مخاطب کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ دنیا ایک معمہ ہے اور زندگی لاحاصل اور بے ثبات ہے:

اب ہم سفرو کہو خدارا
اس دشت کا ہے کہیں کنارا
اللہ یہ ہولناک صحرا
کیا دے گا سوائے خاک صحرا
حیرت مری پوچھتی ہے سب سے
خاموش کھڑے ہوئے ہو کب سے
حیراں ہیں نجوم آسماں پر
لائی ہمیں زندگی کہاں پر
بے آب و گیاہ ہے یہ صحرا
بے چشمہ و چاہ ہے یہ صحرا

دریا ہے تو ریت میں چھپا ہے
چشمہ ہے تو تھک کے سو گیا ہے
پژمردہ ہے پیری و جوانی
تاحدِ نظر نہیں ہے پانی

انسان کی ازلی تشنگی سے شروع ہو کر مثنوی آگے بڑھتی ہے۔ اگلے بند میں شاعر خود کو مخاطب کرتے ہوئے اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ اس کارگاہِ ہستی میں ہر شے پیاسی ہے۔ یہ کائنات سراب اور ریت کی بستی ہے — نفرت ہو یا محبت، دونوں ہی تشنگی کے اسیر ہیں۔

تیسرے اور چوتھے بند میں شاعر ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جو پانی کی تلاش میں حیران اور پریشان ہیں۔ اچانک مدفنِ روحِ آب وگل میں پانی کا عکس چمکتا نظر آیا تو دیوانے اس کی طرف دوڑ پڑے لیکن جو اہلِ خرد تھے، وہ سراب کی حقیقت سمجھ کر اپنی جگہ رہے۔ یہاں شاعر نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ جو کورچشم تھے، ریت کو پانی سمجھ بیٹھے۔ لیکن جو رازدانِ حقائق تھے، ان کا ردِعمل مختلف تھا۔ پانچویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ انسان اپنی تشنگی بجھانے کے لیے نت نئے طریقے ایجاد کرتا ہے۔ کہیں فن کا چشمہ جاری ہے تو کہیں ادب کی نہریں رواں:

اک سو کوئے صنم کے پنگھٹ
اک سو دیر و حرم کے پنگھٹ
عرفاں کے بھرے بھرے پیالے
چھلکاتے ہیں خانقاہ والے
مئے صورتِ آب بٹ رہی ہے
آنکھوں کی شراب بٹ رہی ہے

لیکن اس کے باوجود انسانیت اسی طرح تشنہ لبی کا شکار ہے اور پیاس ہے کہ بجھتی ہی نہیں۔ شاعر کا خیال ہے کہ انسان گم راہ ہو چکا ہے اور خدا نے انسان کو جو روحِ کبریائی دی ہے، وہ اس کے سینے کے اندر گھٹ کر رہ گئی ہے۔

چھٹے اور ساتویں بند میں شاعر اپنے اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ انسان کی الوہی صفتیں مذہب کے ذریعے پروان نہیں چڑھ سکتی ہیں۔ مذہب اور فلسفہ دونوں انسان کو وہم و گمان کے دائرے سے باہر نہیں لاتے، اس لیے شاعر انسان کی تخلیق کا ایک نیا نظریہ پیش کرتا ہے۔ جب خدا نے اس کائنات کی تشکیل کی تو ایک ایسی مخلوق وجود میں آئی جو الوہی اور رحمانی صفات سے متصف تھی۔ آدم کو جنت میں تربیت و تہذیب کے لیے رکھا گیا۔ جنت درحقیقت جائے تربیت تھی جس میں رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ بندوں کو خود اختیاری آجائے۔

آٹھویں سے گیارھویں بند تک شاعر نے آدم کے شاخِ شجر کی طرف جانے کی ممانعت کو بیان کیا ہے۔ جب آدم نے حکم عدولی کی تو خدا کا غرور مسکرا اٹھا اور اس نے انسان کو اس کائنات کا مالک بنا دیا۔ اس بند میں جمیل مظہری نے خیر و شر کی بحث کو فکر و نظر کے بحران کے سوا کچھ نہیں گردانا ہے۔ اقبال کے اس خیال کی جمیل مظہری نے تائید کی ہے کہ انسان کی آمد سے پہلے یہ کائنات اور کائنات کی ہر شے سراپا خاموش سوال بنی ہوئی تھی۔ انسان نے اس کائنات کو معنویت، حسن، ترتیب اور دل کشی دی اور اس کائنات میں مختلف رنگوں کا ظہور ہوا۔

بارھویں اور تیرھویں بند میں جمیل مظہری کہتے ہیں کہ جس انسان کو تقدیر کا حکمراں اور فطرت کا نگہبان بنا کر بھیجا گیا تھا اور جس کا دل الوہیت کا ڈیرہ تھا، وہ دھیرے دھیرے اپنے نفس کا غلام ہو گیا۔ مادّیت نے اسے اپنا محکوم بنا لیا۔ نتیجے میں انسان دنیا کے کام کا رہا اور نہ دین کے کام کا۔ انسان اپنے منصب سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا اور خدا بھی اپنی اس تخلیق سے آسودہ اور مطمئن نہ ہو سکا۔ انسان دراصل کائنات کی حقیقت کو سمجھ ہی نہیں پایا۔ یہ فطرت کے مزاج میں انقلاب لاتا تو عناصرِ کائنات (بادل، ہوا، بجلی، طوفان، سیلاب، زلزلہ وغیرہ) پر انسان کا غلبہ ہو جاتا اور وہ اس پر حکومت بھی کرتا۔ دراصل خدا نے جان بوجھ کر نظامِ فطرت میں نقص اور خامی رکھی تھی کہ انسان اپنی صلاحیت اور صفتِ الوہیت سے اس کی اصلاح کرے گا لیکن شاعر ابھی بھی مایوس نہیں ہے اور کہتا ہے:

اٹھو یہ نشاطِ بزم چھوڑو
طوفاں کی گردنیں مروڑو
دکھلاؤ جلالِ فاتحانہ
کہہ دو کہ رکا ہے یہ زمانہ

آگے کے تین بندوں میں جمیل مظہری نے انسان کی فطرت، حکومت کے نظام اور شریعت کی پابندی کی کمزوریوں کو اجاگر کیا ہے اور تربیت کو مذہب پر فوقیت دی ہے۔ شاعر کے دل کو یہ احساس کچوکے لگاتا ہے کہ دنیا کی ساری مصیبتیں اور غم رہی اس وجہ سے ہے کہ انسان اپنے فرائض سے غافل ہو چکا ہے۔ بغض، عداوت، خساست، کینہ، حسد، تکبر، انسان کی ازلی تشنگی میں اضافہ کرتے ہیں، اس لیے شاعر دشمن سے بھی محبت کا درس دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ یزید کو بھی بخش دیتا ہے۔ دراصل جمیل مظہری انسان میں، اس اخلاقی عظمت اور قلب میں وسعت کے آرزومند ہیں جو انسان کو کبریائی اور الوہیت کی منزل تک لے جائیں کیوں کہ یہی عشق کی آخری منزل ہے۔

سترھویں، اٹھارھویں اور انیسویں بند میں جمیل مظہری نے اپنے مقصد،

نظریے اور پیغام کی مکمل کر تبلیغ کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خدا بندوں کے سجدوں کا بھوکا نہیں ہے۔ وہ طاعت اور سجدے سے بہل نہیں سکتا ہے۔ خدا سے سجدے کی طلب کو منسوب کرنا خدا کی توہین ہے اور سجدوں سے غلامی کا تصور بھی ابھرتا ہے۔ خدا فرعون نہیں ہے کہ انسان اس کے خوف سے اس کی عبادت کرے اور اپنی غلامی کا ثبوت دے۔ جنت اور جہنم کے سود وزیاں سے عبادت میں خلوص، سچائی اور والہانہ پن باقی نہیں رہتا۔

انیسویں اور بیسویں بند میں جمیل مظہری ارتقائے انسانی کی معراج کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ فطرت نے اپنے تمام اسرار انسان پر ظاہر کردیے اور جس دن انسان کائنات کے تمام عناصر کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں کرلے گا، اس میں شانِ کبریائی پیدا ہوجائے گی اور یہی ارتقا کی معراج ہوگی لیکن اس کے بعد ہی شاعر کو احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کی شخصیت میں بقائے جاودانی کا لالچ پنہاں ہے اور یہ بھی اس کی تشنگی کا ایک ثبوت ہے، تب شاعر اپنی شخصیت کے حوالے سے بلیغ انداز سے اس عالمگیر المیے پر تبصرہ کرتا ہے جو انسان کا مقدر ہے۔

آخری بند میں جمیل مظہری نے تمام بانیانِ مذہب کے تئیں احترام کا اعتراف کیا ہے اور اپنی عقیدت کا بھی اظہار کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو دین اور مذہب ان سے منسوب ہیں، وہ عقل اور خودی کے قاتل ہیں، جو صدیوں سے ہمیں افیون پلا کر سلا رہے ہیں۔ انھیں اس کا بھی احساس ہے کہ ان کے اس نظریے اور فلسفے کی وجہ سے انھیں لوگ ملحد اور کافر بھی قرار دے سکتے ہیں لیکن انھیں اس کا کوئی ملال بھی نہیں کیوں کہ:

بے نور سہی چراغ میرا
لیکن ہے یہی دماغ میرا

آخر میں جمیل مظہری اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے ذہن اور فکر میں انتشار اور تشکیک ہے:

افسانہ ہے یہ غرض ہمارا
تشکیک بھی ہے عرض ہمارا

لیکن وہ اس کے بھی طالب ہیں کہ کسی نہ کسی صورت ان کی تشنگی اور روح کی پیاس بجھ پائے:

چونچال ہو آگہی ہماری
بجھ جائے یہ تشنگی ہماری

معاملہ دراصل یہ ہے کہ جمیل مظہری نے اسلام یا کسی دوسرے مذہب کے نظامِ حیات سے وابستگی کے بجائے اخلاق کے بنیادی تصورات کو پیش کیا ہے۔ وہ انسانی عمل میں اخلاقی تصور کو ایک اہم وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے بار بار حرکت وعمل پر زور دیا ہے اور اسے ہی انسان کے لیے طاقت وتوانائی کا سب سے بڑا وسیلہ قرار دیا ہے۔ وہ انسان کی اس خوبی کے قائل ہیں جو اس کے اندر صفتِ الوہیت اور خصوصیتِ ربوبیت پیدا کردے۔ اپنی ذات کے حصار سے باہر نکل کر وہ کائنات کو تسخیر کرلے۔ جمیل مظہری کے نزدیک دو ہی چیزیں اہم ہیں: ایک حرکت و حیات کا نظریہ اور دوسرے عظمتِ آدم کی شناخت۔ اقبال نے بھی انھی دو نظریوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ نظریۂ وحدت الوجود کی مخالفت اقبال نے کی کہ یہ انسان کو تعطّل اور جمود کی طرف لے جاتا ہے اور انسانی قوتوں کو مضمحل کرکے بلندی پر پہنچنے سے روک دیتا ہے، اس لیے اقبال نے ثباتِ خودی کا تصور پیش کیا اور اسے اپنی شاعری میں مرکزیت دی۔ جمیل مظہری نے اقبال کے اس تصور کو بہت احتیاط سے اپنایا اور اس سے وہی چیزیں لیں جو ان کے نزدیک قابلِ قبول تھیں۔ حرکت وحرارت اور انسانی عظمت ان کے فکر ونظر کے محور ہیں۔

مثنوی ''آب و سراب'' کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ جمیل مظہری مذہب، اور زندگی کے تئیں ہمیشہ الجھن اور تشکیک کے شکار رہے لیکن جب تک شاعر کی پوری زندگی، اس کے ذہنی پس منظر اور اس کے نظریۂ حیات سے کماحقہ واقفیت نہ ہو، اس کی شاعری کو سمجھنا بھی تھوڑا دشوار ہوجایا کرتا ہے۔ جمیل مظہری نے اپنی سوانح حیات ''غبارِ کارواں'' میں لکھا ہے:

''بہ حیثیت شاعر میری کوئی شخصیت بنی اور نہ بحیثیت مفکر۔ میں نے تاریخ کے مطالعے میں عمر کا ایک حصہ گزارا اور مورخ بن نہ سکا۔ عمر بھر کا سوچ وچار مجھے فلسفی نہ بنا سکا۔ میں نے کانگریسی تحریک میں حصہ لیا، نوکری چھوڑی اور جیل گیا لیکن ایک سیاسی آدمی بننے کی ہمت مجھ میں نہ ہوئی۔ میری پیٹھ تجربات کے بوجھ سے ٹوٹ رہی ہے، جسے پھینک دینا چاہتا ہوں۔''

(''آج کل''، دہلی، مئی 1970)

اغلب ہے کہ اسی ناآسودگی نے ان میں تشکیک کا عنصر پیدا کردیا اور میرا خیال تو یہ ہے کہ جمیل مظہری کے یہاں فکر ونظر اور فلسفہ وحکمت کے جو اصول موتی موجود ہیں، وہ اسی تشکیک کی عطا ہیں۔

بعض حضرات ''آب وسراب'' پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جمیل مظہری نے اس مثنوی میں خدا کا مذاق اڑایا ہے اور ملحدانہ گفتگو کی ہے۔ بادی النظر میں یہ بات سچ معلوم ہوتی ہے لیکن مثنوی بہ غور پڑھی جائے تو اندازہ ہوگا کہ جمیل مظہری کے یہاں خدا کا تصور روایتی انداز میں نہیں آیا ہے۔ انسان اور خدا کے رشتے پر انھوں نے سنجیدگی سے غور وفکر کیا ہے اور بڑی خوب صورتی سے اپنے نتائجِ فکر کی وضاحت کردی ہے۔ جمیل مظہری خدا کے وجود کے معترف ہیں۔

ان کے جذبات اور خیالات میں ٹکراؤ ہے، اس لیے وہ جذبات کے بجائے خیالات کے وسیلے سے خدائے وحدہ لاشریک تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ سچائی تو یہ ہے کہ حقیقت کی تلاش وجستجو انسان کی اس ازلی تڑپ اور فہم وآگہی کی غمازی کرتی ہے جو انسان کو معرفت تک لے جاتی ہے۔ مجھے حالی کی یہ رباعی یاد آرہی ہے جس میں انھوں نے خدا کی وحدانیت کا ان لفظوں میں اثبات کیا ہے:

ہند نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نہ راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

گویا انسان ہر صورت خدا کے وجود کا قائل اور معترف ہے، ہاں اعتراف کی صورت ضرور بدل جاتی ہے — یہی کیفیت جمیل مظہری کے ساتھ نظر آتی ہے۔

جمیل مظہری نے مختلف زبانوں کے مختلف شعرا سے فیض حاصل کیا اور مذہب اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کا بھی مطالعہ کیا اور ان کی تعلیمات پر کھلے ذہن سے سوچا۔ خود انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے:

''اگرچہ میری شاعری غالب، اقبال، انیس وشاد کی مشترکہ مخلوق ہے۔ لیکن اس تخلیق میں غالب کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ میری مخصوصیت ذہنیت کی تعمیر کے سلسلے میں نیو غالب نے کھودی۔ اس پر کچھ اینٹیں اقبال نے، کچھ رومی وعرفی نے اور کچھ کیبر وورڈ سورتھ نے رکھیں۔ شعرا کے علاوہ مغربی مفکروں میں روسو، نطشے، شمن ہار اور شیلی نے دیواریں اٹھائیں۔ شبلی کے سیاسی وسماجی افکار نے بڑی حد تک میرے سیاسی ذہن کو بنایا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب بیان کا آہنگ میرے گوش سماعت میں سحر انگیز بنتا رہا۔.......... مذاہب عالم میں اسلام کے علاوہ بدھ ازم، زرتشت، قادیانیت، مسیحیت، گاندھی واد، اشتراکیت ان تمام شریعتوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔''

(غبار کارواں،'' آج کل''، مئی 1970)

ان حالات میں شاعر کا ذہن اور فکر گڈمڈ ہوجاتے ہیں اور پھر ایک نظریہ واضح شکل میں ابھر کر سامنے آتا ہے جو شاعر کا اپنا خاص نظریہ بن جاتا ہے۔ جمیل مظہری کی مثنوی ''آب وسراب'' کا مطالعہ کھلے دماغ سے کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس مثنوی کے مختلف ابعاد سامنے آسکیں۔ فلسفے اور شعریت کے خوب صورت امتزاج نے ''آب وسراب'' کو معرکتہ الآرا مثنوی بنادیا ہے۔ انسان کی ازلی تشنگی اور پیاس کے مناظر کو جس فنی چابک دستی کے ساتھ انھوں نے برتا ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ ان کے نظریات سے ہم اتفاق نہ کریں لیکن اس مثنوی کا مطالعہ ایک بڑے شاعر کے ذہن وفکر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu
Maulana Azad College
Kolkata-700013

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ

مصنف: محمد حسن

پروفیسر محمد حسن نے اپنی اس تنقیدی کاوش میں ادب کی ماہیت، شناخت اور اس کے مجلسی رشتوں، مشرق ومغرب کی تنقیدی نظریات، ان میں یکسانیت اور اختلافات کی نشاندہی کرتے ہوئے ادب اور خارج کے تعلق، ادبی معیار اور ادیب کے سماجی رشتوں اور ان کی معنویت کا جائزہ لیا ہے۔ پوری کتاب سات حصوں اور اکیس ابواب میں منقسم ہے۔ ان حصوں اور ابواب میں تنقیدی ادراک کی ابتدا، افلاطون کے تنقیدی جائزے، ارسطو کی بوطیقا، روم میں تنقیدی نظریات، چینی ادب، جاپانی شاعری کے کلیدی تصورات، سنسکرت تنقید میں دھونی، النکار اور رس، عرب کے تنقیدی نظریات، ایران کے تنقیدی نظریات، زندگی اور تاریخ وتہذیب کے ادب پر اثرات، روس اور امریکا میں نئی تنقید، تشکیلیت اور ساختیت، ہیئتی تنقید، مارکسی تنقید اور تقابلی تنقید جیسے موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔

صفحات: 404، قیمت -/28 روپے

راجیش مسرا

پارسی تھیٹر کا شاہکار ڈراما — لیل و نہار

اردو ڈرامے کی ترویج و اشاعت میں پارسی تھیٹریکل کمپنیاں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ اگرچہ پارسی اسٹیج کے ڈراموں پر بے جا اور بجا طور پر بہت سارے اعتراضات کیے جاتے ہیں لیکن یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ امانت کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری کر کے تناور درخت بنانے میں پارسی اسٹیج نے اہم رول ادا کیا ہے۔ پارسی اسٹیج کی بدولت ہی اردو ڈراموں کی محبوبیت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور خان صاحب نسروان جی مہربان جی آرام، رونق بنارسی، حافظ عبداللہ، نظیر بیگ، حسینی میاں ظریف، طالب بنارسی، احسن لکھنوی، پنڈت نرائن پرساد، بیتاب دہلوی اور آغا حشر وغیرہ ڈراما نگار نہایت شان سے منظر عام پر آئے۔ اس وقت اردو میں یہی شعبہ ایسا تھا جہاں اہل قلم مالی حیثیت سے آبرو کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے تھے۔

اس مضمون میں پارسی تھیٹر کی خصوصیات یا تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ پارسی تھیٹر کے چند بہترین ڈراموں میں سے ایک منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی کے تصنیف کردہ ڈرامے 'لیل و نہار' کا اجمالی جائزہ پیش کرنا ہے۔ اس ڈرامے کے متعلق مصنفین ''ناٹک ساگر'' کی یہ رائے ملاحظہ ہو:

''لیل و نہار' جس کا پلاٹ لیٹن کے ناول'' ڈے اینڈ مارننگ'' سے ماخوذ ہے، لٹریچر کا سرمایۂ افتخار ہے اور محاسن ادبی سے مالا مال ہے اور اس ڈرامے کے سب کے سب گانے اردو میں ہیں۔ یہ ڈراما اس قابل ہے کہ کسی بہترین مغربی ڈرامے کے مقابل میں پیش کیا جائے۔''

ڈراما 'لیل و نہار' کو طالب نے خورشید جی بالی والا کی وکٹوریا ناٹک منڈلی کے لیے لکھا تھا۔ یہ 1900 کے بعد کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے اسے طالب کے ابتدائی ڈراموں میں شمار کیا ہے اور اس کا سال تصنیف 1884 لکھا ہے۔(1) لیکن اس ڈرامے کی زبان، مکالموں اور واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کی نومشقی کے زمانے کا ڈراما نہیں ہے۔ یہ ڈراما 1905 میں بمبئی سے باہر ملک کے مختلف شہروں خصوصاً پنجاب میں بہت مقبول ہوا۔

'رسالۂ آزاد' اس پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''ہم اس بات کے قائل نہ تھے کہ کوئی اچھا ناٹک ہندوستانی اسٹیج پر لایا جا سکتا ہے کیوں کہ ہمارا خیال تھا کہ ہندوستانی اسٹیج کا ڈراما رطب و یابس سے خالی نہیں ہو سکتا، مگر حضرت طالب نے ہمارے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا۔ شروع سے آخر تک ایک لفظ ایسا نہیں ملتا جسے بھرتی کا لفظ کہا جا سکے اور ان خوبیوں کے ساتھ وہ دل چسپیاں بھی موجود ہیں جو ڈرامے کو اسٹیج کے لیے موزوں بناتی ہیں۔ لیل و نہار کا ہر ایک سین سنسنی پیدا کر دینے والا ہے۔ فیروز کے قتل اور شہباز کی موت کا سین ایسا دردناک ہے کہ کوئی شخص آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ محکمۂ پولیس کے ایک افسر بھی اس سین کو دیکھ کر رو رہے تھے۔''(2)

رسالہ 'مخزن' لاہور اس ڈرامے پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''28 اکتوبر کی شب کو پہلی مرتبہ اس ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھنے کا موقع ملا۔ لیل و نہار علمی حیثیت سے اعلیٰ پائے کے ناٹکوں میں شمار ہونے کے قابل ہے اور اس کے مصنف کو اس پر بجا ناز ہو سکتا ہے۔ گفتگو بالعموم دل چسپ، شستہ، بے تکلف اور بامحاورہ ہے۔ فقرے فقرے کی دل فریبی سامع کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور اپنی مافوق التوقع انوکھے پن کی وجہ سے دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ عامیانہ اور پیش افتادہ ظرافت کو چھوڑ کر ندرت و جدت سے کام لیا گیا ہے۔ فرسودہ فقرات 'لیل و نہار' میں نام کو بھی نہیں ہیں اور یہ بات بدرجۂ غایت قابل داد ہے کہ ان علمی خوبیوں کے ساتھ اس ڈرامے میں وہ سب باتیں بھی موجود ہیں جو ڈرامے کو اسٹیج پر کامیاب بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ لیل و نہار کا ہر ایک باب دل چسپ موقعوں اور سنسنی پیدا کرنے والے نظاروں سے پُر ہے۔''(3)

'لیل و نہار' کا پلاٹ لارڈ لٹن کے ناول'' ڈے اینڈ مارننگ'' سے ماخوذ ہے۔ اس کے پلاٹ کے متعلق سید امتیاز علی تاج لکھتے ہیں:

''ڈے اینڈ مارننگ'' ایک ضخیم ناول ہے۔ اسے پڑھنے کی ہمت مجھے نہیں ہوئی مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ طالب نے 'لیل و نہار' براہ راست اس ناول سے اخذ نہیں کیا ہوگا۔ کوئی پیش رو وکٹورین ڈراما نویس اس ناول کا ڈراما پہلے بنا چکا ہوگا اور طالب نے اس بنے بنائے ڈرامے سے استفادہ کیا ہوگا۔ دوسرے لٹن کا ناول اتنا ضخیم ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں توقع نہیں ہوتی کہ اس کے طویل اور پیچیدہ پلاٹ کو تین گھنٹے کے ڈرامے کے مناظر میں باندھ سکیں۔(4)

سید امتیاز علی تاج نے 'ڈے اینڈ مارننگ' کے کسی مترجم کا ذکر نہیں کیا ہے

اور ان کا پورا بیان محض قیاس پر مبنی ہے۔ طالب انگریزی زبان سے بہ خوبی واقف تھے اور انگریزی میں انھوں نے شاعری بھی کی ہے۔ ان کی انگریزی نظمیں بنارس کے ہفتہ وار اخبار 'آوازۂ خلق' میں مستقل شائع ہوئی تھیں۔ اگر موقع ملا تو اس پر بعد میں کبھی قلم اٹھاؤں گا۔ کتب بینی طالب کا محبوب مشغلہ تھا۔

انھوں نے یقیناً اس ناول کا مطالعہ کیا ہوگا۔ پلاٹ میں انھوں نے چند تبدیلیاں کر کے اسے اصل سے بھی بہتر بنا دیا۔ بعد میں اسی طرز پر احسن لکھنوی نے 'چلتا پرزہ'، آرزو نے 'متوالی جوگن' اور پنڈت نرائن پرشاد بیتاب دہلوی نے 'زہری سانپ' وغیرہ ڈرامے لکھے۔

قصہ — جہاں سیر اپنے بھائی فلک سیر اور بھتیجے ہمایوں کو اپنے ہمراہ استنبول سے ہندوستان لاتا ہے، فلک سیر نہایت مکار، عیار اور احسان فراموش انسان ہے، وہ جہاں سیر سے اس کے نکاح نامے کے متعلق دریافت کرتا ہے اور نکاح نامہ دیکھنے کی فرمائش کرتا ہے۔ اسی درمیان میں جہاں سیر کی گھوڑے سے گر کر موت واقع ہو جاتی ہے۔ فلک سیر عدالت میں عالم سوز وکیل کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جہاں سیر نے شہناز نامی عورت کو اپنے گھر میں بہ طور داشتہ رکھ لیا تھا جس کے بطن سے فیروز اور انور پیدا ہوئے۔ وہ شہناز، فیروز اور انور کو گھر سے نکال دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ورثہ اور ترکہ میں ان کا حق نہیں۔ اس لیے انھیں جائداد سے برطرف کیا جاتا ہے۔ وہ شہناز اور اس کے بیٹوں کے لیے وظیفہ مقرر کرنا چاہتا ہے لیکن فیروز سختی سے انکار کر دیتا ہے، فلک سیر، شہناز، فیروز اور انور پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتا ہے۔ شہناز آلام و مصائب برداشت نہ کر پانے کی وجہ سے مر جاتی ہے۔ بالآخر اشرف اور اکرم کی مدد سے نکاح نامہ دستیاب ہو جاتا ہے فلک سیر اپنی ناشائستہ حرکتوں پر نادم ہوتا ہے۔ فیروز کی شادی اکرام کی بیٹی دل افروز سے اور انور کی نسترن سے ہو جاتی ہے۔

ایم. ایس. جوہر نے اس ڈرامے کو مرتب کیا اور بھائی دیا سنگھ اینڈ سنس، لاہور کے یہاں سے 1908 میں اس کی اشاعت ہوئی۔ اس میں زبان و کتابت کی بے شمار غلطیاں موجود ہیں۔ اس کی پیش کش کے متعلق سید امتیاز علی تاج جنھوں نے اس ڈرامے کو اسٹیج ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ لکھتے ہیں —

''چوں کہ کہانی کے ایک حصہ کا تعلق امرا کی زندگی سے تھا، اس لیے اس میں بعض پر تکلف مناظر ضرور دکھائے جاتے تھے لیکن احتیاط برتی گئی تھی کہ وہ نمائشی اور تحیر خیز معلوم نہ ہونے پائیں۔ اس زمانے کے انداز آرائش کے مطابق مختلف مناظر میں گھر کا فرنیچر بھی حسب حال استعمال میں لایا جاتا تھا۔ کہیں دیسی تخت اور مسندیں اور گاؤ تکیے، کہیں انگریزی صوفے اور کرسیاں اور میزیں۔ سب کی سب اس زمانے کے مروجہ وکٹوریہ طرز کی۔ امرا میں مردوں کو پاجامہ اور لمبا کرتا اور اس کے اوپر چغہ پہنایا جاتا تھا۔ جس کے اوپر سنہری رو پہلی کام ہوتا۔ سر پر دستار ہوتی۔ عالم سوز وکیل سوٹ پہنتا تھا۔ میں نے تماشوں میں پہلی مرتبہ 'لیل و نہار' کے اس کردار کو سوٹ پہنے ہوئے دیکھا۔ چند جوان کردار غالباً اس خیال سے تھیٹر کاری لباس پہنتے تھے کہ اگر انھیں چغہ دستار پہنائی جاتی تو ان کے معمر ہونے کا اندیشہ تھا۔ نوکروں اور غریبوں کے لباس وہی تھے جو عام زندگی میں پہنے جاتے تھے۔ امرا کے نوکر پاجامہ، اچکن اور پگڑی پہنتے تھے۔ غریبوں کا لباس کرتا، پاجامہ اور ٹوپی تھا۔ شہناز تھیٹر کاری لباس پہنتی تھی جو اس خیال سے نامناسب نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ استنبول سے آئی تھی، رت جگے میں جو عورتیں شامل ہوتی تھیں وہ برقعہ پہنتی تھیں۔ (5)

اردو ڈرامے میں حقیقت نگاری کا رجحان سب سے پہلے طالب کے یہاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے آغاز ہی سے اردو ڈراما نگاری میں حقیقت پسندی کے عناصر شامل کیے اور ایسے کرداروں کی تخلیق کی جو ایسی نوع کے ہیں اور جن سے مل کر اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ 'لیل و نہار' میں حقیقت نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس میں پہلی بار بادشاہوں اور نوابوں کی رومانی زندگی کو ڈرامے کا موضوع نہ بنا کر ایک متمول شخص کے خاندانی واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔

'لیل و نہار' کا ہر ایک کردار بجائے خود ایک سبق ہے۔ فلک سیر کی ہوس پرستی، شہناز کی نیک شعوری، فیروز کی ہمت اور استقلال اور انور کا بھولا پن نہایت دل چسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس کے چند کرداروں کا بھی جائزہ لیتے چلیں۔

فیروز — ڈرامے کا ہیرو اور جہاں سیر کا بڑا بیٹا ہے۔ اپنی ماں کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے مشکل سے مشکل اور بڑے سے بڑا کام کرنے کو تیار رہتا ہے۔ اکرم کے ساتھ مل کر سکہ سازی جیسا غیر قانونی اور جواہر خاں کی دکان پر جھاڑو تک لگانے کا کام کرتا ہے لیکن اس کی خودداری فلک سیر سے کسی طرح کی مدد گوارا نہیں کرتی۔ قتل کے جرم میں گرفتار ہو کر موت کی سزا پاتا ہے۔ حالات پے در پے بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں۔ ہر طرف سے مایوسیاں اور ناامیدیاں اسے گھیر لیتی ہیں لیکن ڈراما کے آغاز سے لے کر انجام تک نکاح نامہ تلاش کرنے اور اپنی ماں کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔

دل افروز — فلک سیر کے مصاحب سفیر جاہ کی بیٹی اور فیروز کی محبوبہ ہے، فیروز سے شدت سے محبت کرتی ہے اور اس کے غم میں برابر کی شریک ہے۔

اشرف — لیل و نہار کا جو کردار سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ اشرف کا کردار ہے۔ یہ کردار ان تمام خوبیوں کا حامل ہے جو ایک نمک خوار اور وفادار ملازم میں ہونا چاہیے۔ بہ حیثیت ایک ادنیٰ ملازم کے وہ تمام نیک خواہشات

اپنے مالک کے بیٹے فیروز کے لیے رکھتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ فیروز کو اس کا کھویا ہوا وقار واپس مل جائے اور اسے عزت و سربلندی حاصل ہو۔ اگرچہ یہ ڈرامے کا مزاحیہ کردار ہے لیکن اپنی سمجھ اور عقل مندی سے آگے آنے والے واقعات اور خطرات کا پتا لگاتا رہتا ہے۔ ان مسائل کی عقدہ کشائی کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ انور کو فلک سیر کے یہاں سے لاکر محفوظ مقام پر چھپا دیتا ہے۔ فیروز کو سزائے موت سے بچانے کے لیے عالم سوز وکیل کی تحریر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وقت پڑنے پر فیروز کی مالی امداد بھی کرتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ ڈرامے کا سب سے مؤثر کردار ہے جو ناظرین کو ہنساتا بھی ہے اور ان کی ہمدردی بھی حاصل کرتا ہے۔

فلک سیر — جہاں سیر کا بھائی اور فیروز کا چچا ہے، یہ بہ ظاہر صاحب زہد و تقویٰ ہے۔ دنیا کے سامنے اپنی ایمان داری اور شرافت کا ڈھول پیٹتا ہے۔ دوسری طرف اپنے بھائی کی بیوی اور بچوں کا ورثہ ناجائز طریقے سے حاصل کر لیتا ہے۔ فیروز اور انور کو جائداد سے برطرف کرنے کے لیے نئی نئی ترکیبیں ایجاد کرتا رہتا ہے اور ہمیشہ انھیں پریشانیوں میں مبتلا رکھتا ہے۔ سفیر جاہ اور عالم سوز کے ذریعے فیروز پر قاتلانہ حملہ کرواتا ہے اور اسے قتل کے جرم میں گرفتار کرا دیتا ہے۔ آخر میں اپنے ہی دام میں پھنس جاتا ہے اور اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا ہے۔ یہ ڈرامے کا ایسا کردار ہے جس کی وجہ سے کش مکش اور پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اور قصے کی دل چسپی برقرار رہتی ہے۔

ہمایوں — یہ فلک سیر کا بیٹا ہے، نہایت رحم دل اور حق پرست ہے۔ اپنے چچازاد بھائیوں پر ظلم کرنے سے فلک سیر کو روکتا ہے اور انھیں ان کا حق واپس کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ انکار کی صورت میں اپنے باپ سے بغاوت کرتا ہے۔ فلک سیر کے منع کرنے کے باوجود شہناز کی عیادت کے لیے جاتا ہے اور فیروز اور انور کی ہر طرح مدد کا وعدہ کرتا ہے۔ شہناز کی موت پر افسوس کرتا ہے اور فیروز کو حوصلہ رکھنے کے لیے کہتا ہے۔ یہ ڈرامے کا واحد کردار ہے جسے دنیاوی حرص و ہوس اور داؤ پیچ سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ دونوں خاندان کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی شخصیت نہایت پرکشش ہو جاتی ہے۔

ان کرداروں کے علاوہ جواہر خان، انور، سفیر جاہ، عالم سوز، دیانت، عنایت، سوسن اور نسترن وغیرہ ڈرامے کے اہم کردار ہیں، جنھوں نے قصے کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

'لیل و نہار' کے مکالمے بہت چست ہیں۔ طالب نے بھرپور کوشش کی ہے کہ ڈرامے کے کردار جو مکالمے ادا کریں ان میں وقار بھی ہو اور کشش بھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں، مثال کے طور پر یہ مکالمے ملاحظہ ہوں۔

فیروز — اماں جان! میرا دل بار بار گواہی دیتا ہے کہ تمھارا نکاح نامہ اسی گھر میں کہیں رکھا ہے۔

اشرف — صاحب، آپ کے چچا نے تمام تلاش کرائی۔ ساری تلاش میں ساتھ رہا، لیکن کہیں نہیں پایا، نراس رہا۔

فیروز — بھائی شاید نظر چوک گئی ہو یا ظالموں نے تمھیں دغا دی ہو۔ جب تک میں خود تلاش نہ کرلوں گا، چین نہ پاؤں گا۔

شہناز — بیٹا ہر صندوق پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اب کیوں کر تلاش ہو سکتی ہے۔

فیروز — مہر لگا دی گئی ہے تو کیا ہوا؟ (مادر) جس چیز میں تمھاری آبرو ہو، وہ چیز اگر فلک سیر کے جگر کے صندوق میں بھی بند ہو اور اس پر فولاد کی مہر لگی ہو تو بھی اس کے توڑنے میں تامل نہ کروں گا۔

شہناز کی موت پر فلک سیر جب فیروز کے گھر جاتا ہے اور اس سے اپنی بعض شرائط قبول کرنے کے لیے کہتا ہے۔ اس وقت کے مکالموں کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

فلک سیر — تیری اتنی کج ادائی پر بھی یہاں ضرور آتا۔ ذرا علاج کراتا، مگر افسوس تو نے خبر تک نہ کی۔

فیروز — خبر لینے کا حق تمھارا تھا مگر تمھیں تو ہمارا مٹا دینا گوارا تھا۔ (روکر) جیتے جی تو پوچھنے تک نہیں آئے اور مرنے کے بعد تماشا دیکھنے آئے۔

فلک سیر — رونے سے کیا فائدہ؟ اب بھی راہ پر آؤ۔ مان جاؤ۔ تمھیں درگزر نہ کروں گا اور تمھارا وظیفہ باندھ دوں گا۔

فیروز — (چڑھ کر) وظیفہ! خیرات کا ٹکڑا! (دانت پیس کر) اے بھائی اور سگائی کے نام کو عیب لگانے والے چچا! اگرچہ عدالت کی جھوٹی سپر نے تمھیں پناہ دی ہے، جھوٹی دنیا نے تم سے بگلا بھگت کو سچے ایمانداروں میں راہ دی ہے۔ مگر یاد رکھنا، ہماری سچی محبت کا آفتاب ہزاروں بادلوں کو پھاڑ کر نکل آئے گا۔ جس سے تمھیں آنکھیں ملانا دشوار ہو جائے گا۔ (کانپ کر رونے کے لہجے میں) او مکار ستم گار! آج میں اپنی مادر مرحومہ کی پاک میت کے سامنے جلے دل سے آہ بھرتا ہوں اور بددعا کرتا ہوں کہ اس مظلوم بیوہ اور بے کس بچوں کی آہ تمھیں اور تمھارے ہوتے سوتوں کو جلائے گی۔ حرام ورثے کو خاک میں ملائے گی۔ (انگلی سے دروازہ بتا کر) بس جاؤ! جب تک اس داد گر کا دستِ انصاف تمھارا گلا نہ دبائے گا، موج اڑاؤ۔

'لیل و نہار' میں طالب نے پہلی بار ہندی گانوں کی جگہ اردو گانے رائج کیے۔ ان گانوں میں ہندی کے بجائے اردو کے الفاظ استعمال کیے گئے۔

ڈرامے کی حمد— "تیسری عالی شان۔ لایزالی شان۔ دیکھی بھالی شان" کو بہت شہرت ملی۔ چوں کہ اس زمانے تک اردو گانے لکھنے کا نہ تو رواج ہی تھا اور نہ یہ کام آسان تھا۔ اس لیے دوسرے ڈراما نگار اس روش کو اختیار کر کے پروان نہ چڑھا سکے۔

آخر میں عشرت رحمانی کے اس بیان کے ساتھ اس مضمون کا خاتمہ مناسب ہوگا۔ "اندر سبھا کے بعد نثر نگاری کا پہلا موڑ جس کے مکالموں میں پہلی بار نثر کا آغاز ہوا اور گانوں میں ہندی کی جگہ اردو شامل کی گئی۔ ڈراما 'لیل و نہار' اس عہد کی پہلی قابل ذکر تصنیف ہے جس کو ممبئی کے پارسی تھیٹر یکل کمپنی کے لیے منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی نے لکھا اور اس کے بعد دوسرے ڈراما نگاروں نے اسی ڈگر پر عرصۂ دراز تک نئے نئے نقوش پیش کیے جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اس سے تقریباً پندرہ سال پہلے ڈھاکہ میں 'بلبل بیمار' لکھا جا چکا تھا جو کمتر درجے کا تھا۔" (6)

حواشی:

(1) ڈاکٹر عبدالعلیم نامی۔ اردو تھیٹر، جلد دوم۔ ص۔ 108

(2) رسالہ 'آزاد' لاہور، اپریل، 1908، ص۔ 15

(3) رسالہ 'مخزن' لاہور، نومبر، 1905، ص۔ 14

(4) سید امتیاز علی تاج۔ اردو کا پرانا تھیٹر، مضمون مطبوعہ 'نقوش' اکتوبر، نومبر و دسمبر، 1944

(5) ایضاً

(6) عشرت رحمانی۔ اردو ڈراما۔ تاریخ و تنقید، ص۔ 272

□□□

پتہ:
Regional Institute of Education (NCERT),
Pookar Road, Ajmer (Rajasthan)

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق، اور سلام کو اعتقاد کے طور پر انفرادیت حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں اخلاق، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھگتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سلام پر اعتقاد کی ہی فضا چھائی ہوئی تھی لیکن یہی صنف جب انیس تک پہنچی تو اس میں ایک جدید ادبی لب و لہجہ قائم ہوا۔ انیس نے سلام میں رثائی موضوعات کے علاوہ ذاتی مسائل، زمانے کی ناقدری، معاصرانہ چشمک اور بلند خیالی جیسے مضامین کو جگہ دی۔

"انیس کے سلام" مرتبہ علی جواد زیدی میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں جس میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔

صفحات: 307، قیمت:۔ 60 روپے

دکنی لغت

مرتبہ: سیدہ جعفر

دکنی شعر و ادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک پہلو ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے، جو اردو زبان و ادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین و ترتیب میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات: 521، قیمت:۔ 590 روپے

محمد ارشد

ناصر کاظمی کی غزلیہ شاعری

بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائیاں نہ صرف عالمی سطح پر معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کے سبب تاریخ کا ایک اہم باب ہیں بلکہ ادبی و ثقافتی منظرنامے پر بھی انقلاب آفریں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ایک نئی حسیت، ایک نئے تخلیقی ادراک اور ایک نئے شعور کی تشکیل کے ساتھ نثر و نظم میں بنیادی تغیرات ظاہر ہو رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم اور ہندوستان کی آزادی کے بعد جس نسل نے ہوش سنبھالا، اس کے سامنے پرانی تہذیبی قدروں کے مقابلے میں نئی سائنسی دنیا اور اس کی تہذیب تھی۔ قدروں کے اس تصادم میں راویتی رشتوں کا تانا بانا ٹوٹتا جا رہا تھا۔ اخلاقی قدروں کے انتشار سے معاشرے میں نت نئے مسائل جنم لے رہے تھے۔ زمانہ رد و قبول کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ چنانچہ تشکیک، خوف، مایوسی، تنہائی، قدیم و جدید کا تصادم، سیاسی اتھل پتھل، یہ وہ عناصر تھے جو آزادی کے بعد اردو شاعری بالخصوص غزلیہ شاعری میں در آئے۔

زمانے کے تغیرات نے جہاں افکار کو متاثر کیا وہیں فنی سطح پر بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ جدید شاعری میں نہ صرف پرانی تراکیب، استعاروں، علامتوں سے انحراف ملتا ہے، بلکہ نئی علامتیں وضع کرنے، مروجہ الفاظ کو نئے معنی پہنانے، اور نت نئے تجربوں کو پیش کرنے کا رویہ بھی عام رہا اور یہ رویہ اس دور کے تقریباً سبھی شعرا کے یہاں کم و بیش دیکھنے کو ملتا ہے۔

ناصر کاظمی ان شاعروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جو اپنی منفرد آواز اور نئے لب و لہجے کے لیے پہچانے جاتے ہیں۔ آزادی کے بعد غزل کو جو حیات نو ملی اور اس کی مقبولیت میں جو اضافہ ہوا اس میں ناصر کاظمی کی غزل کا بھی نمایاں حصہ رہا ہے۔ اگرچہ وہ جدید اسلوب اور نئی فکر کے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں تاہم ان کی شاعری کا آہنگ، اس کا داخلی مزاج اور اس کی جمالیات اپنے نئے پن کے باوجود غزل کی مانوس روایت سے رشتہ استوار کیے ہوئے ہے۔ آزادی کے بعد جہاں شاعری میں ہیئت اور اسلوب کے نئے تجربے کیے گئے وہیں کلاسیکی غزل کی بازیافت اور کسی حد تک رنگ میر کے احیا کی کوششیں بھی ہوئیں۔ ناصر کاظمی نے میر کو خصوصی اہمیت دی۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اپنی میر پسندی کی وجہ یہ بتائی کہ ''میر کا زمانہ رات سے عبارت ہے اور یہ رات ہمارے عہد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے'' اس رات کی تاریکی میں ناصر کاظمی کو یادوں کے بہت سے قافلے گم ہوتے دکھائی دیے۔ غزل کے حوالے سے ناصر کاظمی کی ساری تخلیقی کاوش انھی گم شدہ یادوں کی بازیافت سے عبارت ہے:

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
کیا کہوں اب تمھیں خزاں والو
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

کیا دن تھے جب نظر میں خزاں بھی بہار تھی
یوں اپنا گھر بہار میں ویراں نہ تھا کبھی

مشکل ہے، پھر ملیں کبھی یاران رفتگاں
تقدیر ہی سے اب یہ کرامات ہو تو ہو

جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

صدائے رفتگاں پھر دل سے گزری
نگاہ شوق کس منزل سے گزری

یہ ظاہر میر کے عہد سے ناصر کا عہد مختلف تھا، اس کے مسائل اور تقاضے مختلف تھے، زمانی و مکانی پس منظر مختلف تھا تاہم اس اختلاف کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہجرت کے جس کرب سے ناصر کاظمی عملاً دوچار ہوئے، در بدری کی یہی کیفیت میر کے ساتھ بھی رہی۔ بے اطمینانی اور عدم تحفظ کا احساس جس سے ناصر کاظمی کا عہد عبارت ہے، کم و بیش یہی صورت حال میر کے عہد کی تھی۔ فرق صرف نوعیت کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر عہد کی ابتری و انتشار سے بھری ہوئی زندگی پر ناصر کاظمی کو میر کے اجڑے ہوئے دیار کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایک لمبے زمانی بُعد کے باوجود ناصر کاظمی نے میر کے تجربوں میں اپنے تجربے کا عکس تلاش کر لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر تجربے کی بنیاد مضبوط ہو تو مانوس تجربوں میں بھی حقیقی شاعر کوئی نہ کوئی نئی بات ڈھونڈ نکالتا ہے۔ جس طرح میر کی غزلیں اپنی مجموعی فضا کے حوالے سے ہمیں زندگی کا شعور عطا کرتی ہیں، یہی رویہ ہمیں ناصر کاظمی کے یہاں ایک دوسری صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ میر کی طرح ناصر کاظمی بھی گہری کیفیتوں بہ الفاظ دیگر دھیان کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے انتشار اور ابتری کا بیان یا انفرادی آشوب کا ذکر ایسے اسلوب میں کیا ہے جو دھیما اور نرم ہے۔ میر کے فیضان نے ناصر کاظمی کو اپنے زمانے کے ادراک کا وہ راستہ دکھایا جس پر آگے چل کر انھوں

نے اپنی شاعری کے قصر کی تعمیر کی۔ اگر ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پرانی یادوں سے تعلق خاطر کے باوجود اپنے عہد کی سیاسی وسماجی تبدیلیوں پر ناصر کاظمی کی کتنی گہری نظر تھی۔ معاصر عہد کی المناک صورت حال پر ان کے اشعار ملاحظہ ہوں:

انھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں
زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جائے
ان سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے
ہم نے دیکھے ہیں وہ سناٹے بھی
جب ہر اک سانس صدا ہوتی ہے
مٹی مٹی سی امیدیں، تھکے تھکے سے خیال
بجھے بجھے سے، نگاہوں میں غم کے افسانے

شاعری جذبے اور تخیل سے جنم لیتی ہے۔ جذبات اور تخیلات کی پرورش ماحول کرتا ہے — شاعری اس سماجی اور معاشرتی ماحول ہی کی پروردہ ہوتی ہے جس میں شاعر جی رہا ہے۔ جذبے کی قوت وتوانائی اور تخیل کی خوبصورتی ودلکشی کا انحصار شاعر کی نجی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس کے گردوپیش کے حالات پر بھی منحصر ہے۔ ناصر کاظمی بھی اپنے عہد میں پرورش پانے والے مختلف النوع فکری میلانات اور تصورات سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے جس وقت شاعری شروع کی، ان کے پیش نظر کئی پیچیدہ سیاسی ومعاشرتی مسائل تھے۔ روبہ زوال تہذیبی قدریں تھیں، دم توڑتی ہوئی انسانیت تھی، غم زدہ شہروں کی خلوق اور صنعتی زندگی کی قہرسامانیاں تھیں۔ ناصر کاظمی عصری زندگی سے پوری طرح وابستہ رہے اور تخلیقی سطح پر اس سے ان کا اٹوٹ رشتہ رہا۔ تاہم ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بعض معاصرین کے برعکس ان مسائل وموضوعات پر نظریاتی تبصرے نہیں کیے اور نہ ہی ان کی براہِ راست پیش کش کو اپنا شعار بنایا۔ انھوں نے ان موضوعات ومسائل کو اسی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی جب انھیں اپنے ذاتی تجربے ومشاہدے سے ہم آہنگ پایا۔ درج ذیل، اشعار ملاحظہ کیجیے جو خارج اور داخل کی ہم آہنگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں:

شہر سنسان ہے کدھر جائیں
خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں
ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے
دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے
اتنی خلقت کے ہوتے
شہروں میں ہے سناٹا
ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے
کہیں اجڑی اجڑی سی منزلیں کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام ودر
یہ وہی دیار ہے دوستو، جہاں لوگ پھرتے تھے رات بھر
نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصر
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی

1947 کا ہنگامہ خیز دور دوگونہ تجربوں کا دور تھا۔ ایک طرف آزادی کی خوشی، دوسری طرف تقسیم وطن کا کرب اور اس کے جلو میں آیا ہوا انسانی آشوب۔ شعرا کی ایک بڑی تعداد نے اس دور کی بربریت کو پوری شدت سے محسوس کیا اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ناصر کاظمی کی غزلوں میں بھی اس دور کے دلدوز مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بالخصوص ہجرت کے تجربے کو جس معروضیت، حساسیت اور دردمندی سے انھوں نے پیش کیا، اور جس طرح اسے تخلیقی جہت عطا کی وہ انھی کے ساتھ مخصوص ہے۔ تقسیم، فسادات اور ہجرت پر ان کے اشعار ملاحظہ ہوں:

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
تو ہی بتا ترے بے خانماں کدھر جائیں
کہ راہ میں شجر سایہ دار بھی تو نہیں
کہیں آگ اور کہیں لاشوں کے انبار
بس اے دورِ زماں دیکھا نہ جائے
اتفاقاتِ زمانہ بھی عجب ہیں ناصر
آج وہ دیکھ رہے ہیں جو سنا کرتے تھے
کھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا
وہ لوگ تھے نہ وہ جلسے نہ شہرِ رعنائی
یہاں اک شہر تھا شہرِ نگاراں
نہ چھوڑی وقت نے اس کی نشانی
ہم جہاں روز سیر کرتے تھے
آج سنسان ہے وہ راہگور

تمام عمر جہاں ہنستے کھیلتے گزری
اب اس گلی میں بھی ہم ڈرتے ڈرتے جاتے ہیں
رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

مذکورہ بالا اشعار اپنے اندر دکھ، درد اور اداسی کی اس کیفیت کو سموئے ہوئے ہیں جو تقسیم وطن کے ساتھ ہجرت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد کے حصے میں آئی۔ اپنی زمین اور اپنی تہذیبی و ثقافتی جڑوں سے جدا ہونے کا یہ احساس ناصر کاظمی کی غزلوں میں حزن وملال کی ایک ایسی کیفیت پیدا کردیتا ہے جو اثر انگیزی میں اپنی مثال آپ ہے۔ بلاتامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ تقسیم وطن، فسادات، ہجرت اور اپنی جڑوں سے بچھڑنے کا غم اور ان سے پیدا ہونے والے انسانی مسائل نے ناصر کاظمی کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ یہی تاثر ہے جو انھیں دن کے ہنگاموں میں مگن رہنے سے زیادہ رات کے سناٹوں سے مکالمہ کرنے اور اپنی ذات کے معبد میں پناہ گزیں ہونے کے لیے اکساتا ہے:

اپنی دھن میں رہتا ہوں
میں بھی تیرے جیسا ہوں
او پچھلی رت کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں
یونہی اداس رہا میں تو دیکھنا اک دن
تمام شہر میں تنہائیاں بچھا دوں گا
دن بھی اداس اور مری رات بھی اداس
ایسا تو وقت اے غمِ دوراں نہ تھا کبھی
خیالوں ہی میں اکثر بیٹھے بیٹھے
بسا لیتا ہوں اک دنیا سہانی
ناصر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اداس
وہی پرانی باتیں اس کی وہی پرانا روگ

ناظر کاظمی ایسے معاشرے میں زندگی بسر کررہے تھے جہاں حقیقی مسرت کے سوتے خشک ہوچکے تھے اور قلبی آسودگی اور روحانی طمانیت کا تصور ایک موہوم سا خواب بن کر رہ گیا تھا، تاہم ناصر کاظمی نے نہ تو یاس پرست بننا گوارا کیا اور نہ ہی قنوطیت کے شکار ہوئے۔ ان کی شعری عظمت کا راز اسی امر میں پوشیدہ ہے۔ حالات کی خرابی کے باوجود ناصر کاظمی کا خیال ہے کہ:

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی
مایوس نہ ہو اداس راہی
پھر آئے گا دورِ صبح گاہی

اے منتظرِ طلوعِ فردا
بدلے گا جہانِ مرغ و ماہی

ناصر کاظمی نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جو ان کے تجربات عشق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے عشقیہ اشعار دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی آواز معلوم ہوتے ہیں اور بڑے لطیف احساسات کے حامل ہیں:

اے دل کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی
تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی
کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے
تری نگاہِ تغافل کو کون سمجھائے
کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار بھی تو نہیں
آرائشِ خیال بھی ہو دل کشا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے دل چاہتا بھی ہو

ناصر کاظمی کی شاعری کے سرسری مطالعے سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عصری حسیت ان کی غزلوں کا خاص وصف ہے۔ انھوں نے تہذیبی اقدار کی شکست کے نوحے بھی رقم کیے اور انسان کی ازلی اور ابدی تنہائی کو بھی موضوع سخن بنایا۔ ان کے تجربے حقیقی ہیں اور ان کی جڑیں زندگی میں پیوست نظر آتی ہیں۔ انھوں نے غزل کے روایتی انداز کو اندر سے بدلنے کی کوشش کی تاہم انھوں نے ایسے تجربوں سے اجتناب کیا جو غزل کی مانوس روایت سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ موضوعاتی سطح پر ان کے یہاں تنوع نہ سہی تاہم انھوں نے جس طرح اپنے واردات کو شعری زبان دینے کی کوشش کی ہے، اس کی اثر انگیزی میں کلام نہیں۔ وہ اپنے داخلی تجربات اور خارجی مشاہدات کے نقوش کو بھی ہمارے دل ودماغ میں جاگزیں کردیتے ہیں۔ شام، رات، سحر، صبح، ہجر، فراق، خزاں، بہار، شہر جیسے الفاظ سے وہ جس فضا کی تخلیق کرتے ہیں وہ معاصر صورت حال کی عکاسی کے ساتھ ساتھ تجربے کی ایک انوکھی دنیا کی بھی سیر کراتے ہیں۔

□□□

پتہ:
Near, Madrasa Shamsul Olum,
Post Ghosi, Distt Mau,
U.P. 275304

احمد صغیر

احمد یوسف کا افسانہ — 23 گھنٹے کا شہر

1960 کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کے مقام کو بلند کیا ان میں ایک نام احمد یوسف کا بھی ہے۔ حالانکہ احمد یوسف کا پہلا افسانہ 1949 میں شائع ہو چکا تھا اور اس وقت تک ان پر ترقی پسندی کا اثر غالب تھا۔ کچھ سال خاموش رہنے کے بعد جب انھوں نے 1967 سے دوبارہ لکھنا شروع کیا تو ان کا انداز اور اسلوب دونوں بدل چکے تھے۔ احمد یوسف نے اپنے افسانوی آرٹ کے ذریعے خیال، اسلوب، موضوع اور ہیئت کی علاحدہ علاحدہ شناخت قائم کی ہے۔ ان کے افسانوں میں عصر حاضر کی زندگی اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ تخلیقی تجربوں کے آئینہ خانوں سے ہوکر گزرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

احمد یوسف کے چار افسانوی مجموعے ''روشنائی کی کشتیاں'' (1976) ''آگ کے ہمسائے'' (1980) ''23 گھنٹے کا شہر'' (1984) اور ''رزم ہو یا بزم'' (2004) شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے کئی افسانے مقبول ہوئے لیکن ''23 گھنٹے کا شہر'' موضوع اور اسلوب کی سطح پر کافی موضوع بحث رہا۔

''23 گھنٹے کا شہر'' ایک ایسے شہر کی کہانی ہے جہاں 23 گھنٹے قیامت کا منظر ہے۔ دہشت وخوف کی حکومت ہے۔ شہر کا ہر شخص پریشان حال ہے۔ 23 گھنٹے کے بعد محض ایک گھنٹہ عارضی سکون کا ہے۔ ضروریات زندگی کی تکمیل اسی ایک گھنٹے میں طے پاتے ہیں:

''23 گھنٹوں میں وہ عام گھڑیوں سے کام لیتے جن میں گھنٹے اور منٹ کا حساب ہوتا لیکن جونہی 23 واں گھنٹہ ختم ہوتا وہ اپنی اپنی کلائیوں پر ایک خاص قسم کی گھڑی باندھ لیتے جن میں صرف سکنڈوں کا حساب ہوتا کیونکہ اس شہر کا ہر فرد یہ جانتا تھا کہ یہاں 23 گھنٹے حبشیوں کی حکومت ہوتی ہے اور 24 واں گھنٹہ ان کا اپنا ہوتا ہے۔

ایک گھنٹے میں 60 منٹ ہوتے ہیں اور ہر منٹ میں ساٹھ سکنڈ۔ اس طرح گھنٹے میں 3600 سکنڈ ہوتے ہیں تو یہ خاص گھڑی سکنڈوں کی گھڑی تھی اور ان 3600 سکنڈوں میں بلا کی تیز رفتاری کے ساتھ وہ سارے کام انجام دیتے — بازار، دفتر، بینک، خریداریاں، ملنا جلنا، شادی بیاہ، عیادت تعزیت سب کچھ اسی ایک گھنٹے میں ہوتا۔ یہ وقت جو ان کے لیے خاصہ قیمتی ہوتا اس کا پورا لیکھا جوکھا ان کے پاس ہوتا — 3600 سکنڈوں کا،

دفتر — 1200 سکنڈ

بازار اور دوسرے ضروری کام — 1200 سکنڈ

ملنا ملانا — 600 سکنڈ

واپسی — 600 سکنڈ

کل — 3600 سکنڈ

اس افسانے میں سیاسی جبریت اور اس سے پیدا ہونے والی شدید ترین گھٹن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انسان کی فطرت میں شامل ہے آزاد فضا میں سانس لینا اور جب کبھی جبر اور ظلم کی زنجیر اس کے پیروں میں ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ تمام زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہونا چاہتا ہے لیکن تنہا ظلم کا مقابلہ ممکن نہیں اس لیے افسانہ نگار کا زور اس بات پر ہے کہ ''سوچو تو سارے شہر کے لیے سوچو'' — احمد یوسف نے افسانے کے آخر میں یہ لکھ کر افسانے کو کمزور کر دیا ہے کہ ''وقت صرف ایک گھنٹہ ہے'' — انقلاب یا احتجاج کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں۔ جن 23 گھنٹوں میں ظلم اور جبر کی حکومت قائم رہتی ہے اگر ہر گھر کا ہر فرد مقابلے کے لیے گھر سے باہر آجائے تو ظلم کا خاتمہ ہوسکتا ہے لیکن وہ عبادت گاہوں میں امن کے متلاشی ہیں:

''شہر کے ہر گھر میں ایک کمرہ عبادت خانے کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا جہاں لوگ اپنے اپنے طور پر عبادتیں کرتے اور ان بلاؤں سے نجات حاصل کرنے کی دعائیں مانگتے۔ چونکہ یہ بدروحیں عبادت خانوں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتی تھیں، اسی لیے شہر میں رسم چل گئی تھی کہ جب وہ لوگ ان بلاؤں کے ہاتھوں بے حد تنگ آجاتے تو اپنے اپنے گھر کے عبادت خانے میں پناہ لیا کرتے۔''

اس افسانے میں بہت سے واقعات کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے جو افسانہ نگار کے تجربے کا حصہ ہیں۔ افسانہ علامتوں میں سوچا گیا اور استعاروں میں بیان کیا گیا ہے اس لیے اسلوب علامتی اختیار کیا گیا ہے لیکن یہ علامتیں ایسی ہیں جو قاری کی سمجھ سے باہر نہیں ہیں۔ قاری کی رسائی آسانی سے ہو جاتی ہے افسانے پر جدیدیت کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ افسانے میں کوئی کردار نہیں ہے

صرف مناظر کے ذریعے کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ کہیں کوئی مکالمہ بھی نہیں۔
اس افسانے کے بارے میں ظہیر صدیقی رقمطراز ہیں:

"افسانے کا موضوع یا محرک ٹھوس اور واضح نہیں۔ سیال اور دھندلا ہے۔ اس لیے علامتی پیرایۂ اظہار نے نامانوس فضا کو مانوس اور عجیب وغریب تاثر کو روشن اور شدید بنادیا ہے۔ علامتوں کے انتخاب اور پھر ان کے معنی خیز انسلاکات میں فنی مہارت جھلکتی ہے۔ قدرت بیان نے ایک تاریک و پیچیدہ موضوع کو روشن اور واضح بنا دیا ہے اور ارتقائے خیال بھی ہے اور تاثر کا ابلاغ بھی۔ بنیادی یا ذیلی علامتیں قاری کو گمراہ نہیں کرتیں بلکہ مرکزی خیال کی رسائی میں معاون ہوتی ہیں۔"

("آہنگ"، فکشن نمبر، صفحہ 72)

ڈاکٹر انور سدید کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے:

"اس افسانے کا پیٹرن خاصہ ڈھیلا ہے۔ مختلف مثالوں کا حوالہ دے کر افسانہ نگار نے اس میں شعوری پیوند کاری کی ہے۔ تاہم ان سب واقعات میں ایک مشترک قدر آزادی کے تحفظ کی صورت میں نمایاں نظر آتی ہے چنانچہ یہ افسانہ ایک ایسے کیمپڈ شخص کی تخلیق نظر آتا ہے جو اپنی آزادی کو اور فرد کی آزادی کو بہت عزیز تصور کرتا ہے اور جب اسے محدود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو بے چین اور مضطرب ہوجاتا ہے۔"

("آہنگ"، فکشن نمبر، صفحہ 64)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ "23 گھنٹے کا شہر" ایک کامیاب علامتی افسانہ ہے۔ جس میں ایک گھنٹہ تیئس گھنٹوں پر حاوی ہے اور اس مقصد کے لیے افسانہ نگار نے تیئس گھنٹوں کی جزئیات "محبوس انسانوں کے دل میں پیدا ہونے والا جزرومد، محبس سے نجات پانے کی تمنا، دفاع ذات، دوسرے انسانوں کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنے کی آرزو وغیرہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

□□□

پتہ:
Roy li Pokhar, Police Line,
Gewal Bigha,
Gay a-823001 (Bihar)

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں "پس نوشت: آج یہ کتاب" کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت-/228 روپے

اندر سبھا کی روایت

مصنف: پروفیسر محمد شاہد حسین

سنسکرت ڈرامائی روایات کی زائیدہ "اندر سبھا کی روایت" ایک ایسی روایت ہے جس نے ہندوستانی ڈرامائی روایات کی توسیع کے ساتھ ایک صدی تک اردو ڈرامے پر اپنے اثرات مرتب کیے، پروفیسر محمد شاہد حسین نے بڑی باریکی سے اس کا جائزہ لیا ہے۔ تین باب اور کئی ذیلی ابواب کے تحت انھوں نے سنسکرت ڈرامے کی روایات، عوامی روایات جیسے رام لیلا، راس لیلا، بہروپیا، بھنڈیتی، بھگت بازی، نقالی، کتھ تھلی کا ناچ، داستان گوئی، مرثیہ خوانی، مجرے، درباری ڈرامے اور پارسی اسٹیج کا ادبی وفنی نقطۂ نظر سے تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔

صفحات: 343، قیمت-/140 روپے

اقبال محی الدین

سائنس اور انسانی زندگی

سائنسی ترقی نے ہمارے ہر شعبۂ حیات کو متاثر کیا ہے خواہ وہ معدنیات، صنعت وحرفت اور زراعت ہوں یا ایٹمی توانائی، آمدورفت کی آسانیاں، ادویات، ماحولیات، دفاعی سامان، ٹیلی فون، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، پرنٹنگ پریس اور ریموٹ سنسنگ وغیرہ جیسے اہم شعبے ہوں۔ پہلے ہم معدنیات کی بات کرتے ہیں۔ معدنیات قدرت کا ایک قیمتی تحفہ ہے۔ یہ تحفہ ہندوستان کو عطا کرنے میں قدرت نے بڑی فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں معدنیات کثرت سے پائی جاتی ہیں جس سے ملک کی معاشی حالت بتدریج بہتر ہو رہی ہے۔ معدنیات اور توانائی کے وسائل کی بدولت ہی ہندوستان صنعتی اعتبار سے کم وبیش خود کفیل ہونے کی توقع کرسکتا ہے۔ خام لوہا، لوہے اور اسٹیل کی صنعت کے لیے اہم خام مال ہے اور ہندوستان اعلیٰ درجے کا اسٹیل بنانے کے لیے ضروری خام مینگنیز کے ذخائر سے مالا مال ہے۔ یہاں باکسائیٹ کے بھی بڑے بڑے مخزن ہیں جن سے المونیم نکالا جاتا ہے۔ بجلی کی صنعت کے لیے ابرق ایک ضروری شے ہے جو ہمارے ملک میں کثرت سے ملتی ہے۔

یہاں کوئلہ، باکسائیٹ، تانبہ، سونا، نمک، السنائیٹ، مونا زائیٹ، زرکون، لائم اسٹون اور ڈولومائیٹ جیسی معدنیات بھی پائی جاتی ہیں۔ ان معدنیات کو قابل استعمال بنانے میں سائنس اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ہندوستان میں زراعت پر منحصر صنعتوں کی اہمیت زیادہ ہے۔ یہ صنعتیں ہماری اقتصادیات میں اہم مقام ہی نہیں رکھتیں بلکہ ملک کے کروڑوں لوگوں کو روزگار بھی دیتی ہیں۔ کپڑا، شکر، مشروبات، نباتاتی تیل، تمباکو، ربر، کاغذ اور ڈیری اس طرح کی اہم صنعتیں ہیں۔ سائنسی ترقیات نے عمدہ مشینوں کو جنم دیا جن سے ہمیں بہترین سوتی، ریشمی، مصنوعی دھاگے سے بنے ہوئے کپڑے اور اونی کپڑے دستیاب ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہاتھ کرگھا اور کھادی کی صفت، ناریل کے ریشے کی صنعت، شکر کی صنعت، بناسپتی کی صنعت اور کاغذ کی صفت کی ترقیات بھی سائنس کی ہی دین ہیں۔

ہماری روایتی صنعتوں کے برعکس زیادہ تر جدید صنعتیں معدنیات پر مبنی ہیں۔ لوہا، فولاد اور کیمیائی صنعتیں اس طرح کی اہم صنعتیں ہیں۔ لوہے اور فولاد کی صنعت کا آغاز 1907 میں بہار کے جمشید پور شہر میں جمشید جی ٹاٹا کے قائم کردہ لوہے اور فولاد کے کارخانے سے ہوا تھا۔ خام لوہا، چونے کا پتھر اور کوئلہ اس صنعت کی اہم خام اشیا ہیں، جو اس علاقے میں بہت پائی جاتی ہیں۔ جدید مشینوں کے استعمال سے یہ صنعت بہت ترقی کر رہی ہے۔ ریل کی پٹریاں فولاد سے بنائی جاتی ہیں جن پر تیز رو ریل گاڑیاں دوڑتی رہتی ہیں اور مال اور مسافروں کو ملک کے کونے کونے تک پہنچاتی ہیں۔

ہماری انجینئرنگ اور مشینی صنعت نے بھی سائنس کی ترقی کے ساتھ ترقی کی ہے۔ کپڑا، سیمنٹ، شکر، کاغذ اور کان کنی کی صنعتوں کے لیے مشینیں ملک میں تیار ہونے لگی ہیں۔

ریل کے ڈبے اور انجن ہندوستان میں بنتے ہیں۔ بھاپ انجن، ڈیزل اور بجلی سے چلنے والے ریلوے انجن چترنجن میں بنائے جاتے ہیں۔ چھوٹی لائن کے انجن جمشید پور میں بنتے ہیں۔ چنئی کے قریب پیرم بور میں سواری گاڑی کے ڈبے بنائے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں جہاز سازی کے چار بڑے کارخانے وشاکھاپٹنم، کولکاتا، ممبئی کے نزدیک مزگاؤں اور کوچین میں ہیں۔ مزگاؤں کے جہاز سازی کے کارخانے میں ہندوستانی بحری فوج کے لیے جنگی جہاز بنتے ہیں۔ یہاں مسافر اور بار برداری جہاز بھی بنائے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس کی ترقی سے انسان نے زمین تو زمین سمندروں تک پر اپنی حکمرانی قائم کرلی ہے۔

ہندوستان میں ٹرک، موٹر گاڑیاں، جیپ گاڑیاں، اسکوٹر، بائیک اور سائیکلیں بنتی ہیں۔ کولکاتا میں Ambassador کاریں، ممبئی میں Fiat اور چنئی میں اسٹینڈرڈ ڈیزل نام کی کاریں بنائی جاتی ہیں۔ اسکوٹر پونے، ممبئی، لکھنؤ، اور الور میں تیار کیے جاتے ہیں۔ گڑگاؤں (ہریانہ) میں ماروتی کاریں بنتی ہیں۔ ان تیز رو سواریوں سے زندگی بہت آرام دہ ہوگئی ہے اور دنوں کا سفر چند گھنٹوں میں طے ہوجاتا ہے۔

ہوائی جہاز کی صنعت ہندوستان میں حال ہی میں شروع کی گئی ہے۔ اس صنعت کے اہم مراکز ہیں۔ بنگلور، کانپور، ناسک، حیدرآباد اور لکھنؤ۔

کسی ملک میں سیمنٹ کی کھپت وہاں کی تعمیری سرگرمیوں اور ترقیاتی کاموں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ 1904 میں چنئی میں سیمنٹ کا پہلا کارخانہ لگایا گیا تھا۔ اب ملک میں سیمنٹ کے بہت سے کارخانے ہیں۔ اس صنعت کا

انحصار چونے پتھر پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے کارخانے انھی علاقوں میں لگائے جاتے ہیں جہاں یہ خام مال دستیاب ہوتا ہے۔ سیمنٹ کا بنانا بھی ایک سائنسی عمل ہے جس سے پختہ مکانات اور دیگر تعمیرات انسانی زندگی کو آرام دہ بناتی ہیں۔

ہندوستان متعدد کیمیائی اشیا اور ادویات تیار کرتا ہے۔ اس صنعت کے پبلک سیکٹر میں حکومت نے کئی کارخانے قائم کیے ہیں۔ اب ہندوستان اینٹی بایوٹک ادویات بنانے میں خود کفیل ہو چکا ہے۔ پونے کے نزدیک پمپری کے مقام پر ہندوستان اینٹی بایوٹک، رشی کیش کا اینٹی بایوٹک کارخانہ، حیدر آباد کا سنتھیٹک ڈرگ پلانٹ (Sy nthetic Drug Plant) اور چنئی میں سرجری یا جراحی کے آلات کا کارخانہ اس سمت میں حکومت کے اہم اقدامات ہیں۔ جراثیم کش دوا DDT تیار کرنے کے دو کارخانے دلی اور الوائے میں ہیں۔ یہ کامیابیاں بھی سائنسی ترقی ہی کی دین ہیں۔

ہندوستان کی کثیر آبادی کو غذا مہیا کرنے کے لیے کیمیائی کھاد بہت اہم ہے۔ پبلک سیکٹر کے کیمیائی کھاد کے اہم کارخانے سندری، نانگل، ٹرامبے، گورکھپور، نام روپ، درگا پور، برونی، رراما گنڈم، نمجھر، ہلدیا، الوائے، کوچین، چنئی، روڑکیلا اور نیویلی میں ہیں۔ پرائیویٹ سیکٹر کے اہم کارخانے وارانسی، وڈودرا، وشاکھا پٹنم، کوٹا اور کانپور میں ہیں۔ کیمیائی کھاد کے استعمال سے زراعت میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔

بجلی کے سامان اور بھاری برقی مشینوں کی صنعت میں سائنس کا اہم کردار رہا ہے۔ ہندوستان میں کئی طرح کی چیزیں۔ مثلاً بلب، فلوریسنٹ ٹیوب وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔ لیکن بھاری مصنوعات اور برقی آلات مثلاً ۔ برقی موٹر، ٹرانسفارمر، موٹر اسٹارٹر، Switch Gear، ٹربائین، اسٹیم ٹربائن یعنی بھاپ سے چلنے والے پہیے، جنریٹر، پاور ٹرانس فارمر وغیرہ زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

بھوپال کا Bharat Heav y Electrical Ltd. (BHEL) اور ہردوار کا بھارت ہیوی الیکٹریکلس (BHE) پبلک سیکٹر کے دو بڑے کارخانے ہیں۔ ہندوستان Cables میں برقی ترسیل کے لیے بھاری تار بنائے جاتے ہیں۔

فریج، واشنگ مشین، بجلی کے پنکھے، کولر اور اے۔ سی۔ ٹیلی فون، موبائیل، ریڈیو، ٹرنزسٹر، ٹیپ ریکارڈر، ٹیلی ویژن اور وی۔ سی۔ آر وغیرہ سب ہندوستان میں بنائے جاتے ہیں۔ ملک میں اعداد و شمار کی حسابی مشینیں اور کمپیوٹر بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ دفاعی ضرورت کے لیے راڈار اور بہت پیچیدہ دیگر الیکٹرانک آلات بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ اس صنعت کے اہم مراکز بنگلور، حیدر آباد، پونے، کولکاتا اور دلی میں ہیں۔

معدنی تیل کو صاف کرنے والی اور پیٹرو کیمیکل کی صنعت میں بھی سائنس کا اہم رول رہا ہے۔ جدید صنعتیں، بجلی سے چلنے والی مشینوں کے ذریعے چلائی جا رہی ہیں۔ توانائی حاصل کرنے کے دو عام معدنی ذرائع کوئلہ اور معدنی تیل ہیں۔ قدرتی گیس کی تلاش و تحقیق خام تیل حاصل کرنے اور اسے صاف کرنے کا کام جاری ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم قدم آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن کا قیام ہے۔ آسام اور گجرات اور بمبے ہائی میں تیل کی تلاش کی کوششیں کامیاب ہوئی ہیں۔ تیل صاف کرنے کے کارخانے ڈگبوئی، ٹرامبے، وشاکھا پٹنم، کویالی، چنئی، کوچین، متھرا اور برونی میں ہیں۔

پیٹرو کیمیکل ایک نیا صنعتی میدان ہے جس میں ترقی کے بے انتہا امکانات ہیں۔ ہندوستان میں معدنی تیل سے متعدد چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ پلاسٹک، کیمیائی طریقے سے بنے ہوئے ریشے مثلاً نائیلون اور پولی ایسٹر اور مصنوعی ربر پر مشتمل ہیں۔ پیٹرو کیمیکل کے بڑے کارخانے گجرات میں وڈودرا کے قریب اور مہاراشٹر میں ممبئی کے قرب و جوار میں واقع ہیں۔

دفاعی ساز و سامان کی صنعت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ملک کی وسیع سرزمین لمبی اور پہاڑی سرحدوں، ساحل، علاقائی سمندر اور ملکی فضا کی حفاظت کے لیے منظم بری، بحری اور فضائی افواج کی بیحد اہمیت ہے۔ اس میدان میں بھی ہندوستان نے خود کفیل ہونے کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں۔ اب ہمارے ملک میں جنگی ساز و سامان، بندوقیں، چھوٹے بڑے ہتھیار، توپ، ٹینک اور گولا بارود وغیرہ تیار کیے جاتے ہیں۔ یہاں بھی سائنس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

چھوٹی موٹی صنعتیں بھی ملک کے مختلف حصوں میں ترقی کر رہی ہیں۔ مثلاً چمڑے کا سامان، دیا سلائی، لکڑی کا سامان، سگریٹ، ربر کا سامان وغیرہ کی صنعتیں ملک کے الگ الگ حصوں میں قائم ہیں۔ چمڑے کا سامان آگرہ، کانپور، کولکاتا، چنئی، ممبئی، احمد آباد، حیدر آباد اور گوالیار میں تیار کیا جاتا ہے۔ شیشے کا سامان کولکاتا، فیروز آباد، ممبئی، امبالہ، جبل پور، شیر کوٹ (یو۔ پی۔)، گوالیار، وڈودرا، شکوہ آباد اور دھول پور میں۔ دیا سلائی بریلی، احمد آباد، کولکاتا، ممبئی، سری نگر، ڈھبری، پیلی بھیت، ناگپور، حیدر آباد، پونے، وشاکھا پٹنم، چنئی، بنگلور، مدورائی، کوئم بتور میں بنائی جاتی ہیں۔ لکڑی کا سامان بریلی، احمد آباد، کرتار پور (جالندھر)، دہرہ دون، گوہاٹی، ڈبرو گڑھ، بنگلور، سہارن پور، نگینہ اور شیر کوٹ میں تیار کیا جاتا ہے۔ سگریٹ چنئی، تروچراپلی، ممبئی، ناگپور، کولکاتا، حیدر آباد، آگرہ اور جموں میں تیار کی جاتی ہے۔ ربر کا سامان تھیرو اننتا پورم، کوزی کوڈ، بنگلور، ممبئی، ناگپور، کولکاتا، احمد آباد، دلی، پونے، کوچین اور جموں میں تیار کیا جاتا ہے۔ یہ سب چیزیں سائنسی ترقی کے ساتھ فروغ پاتی گئیں اور انسانی زندگی کے لیے آرام دہ بنتی گئیں۔

زراعت کے فروغ میں بھی سائنس کا اہم رول رہا ہے۔ کثیر المقاصد منصوبوں کے عمل میں آنے سے آبپاشی اور بجلی کی سہولتیں بڑھیں۔ بھاکرا ننگل

باندھ پنجاب میں قائم ہے جس سے بجلی اور آب پاشی کے لیے پانی ملتا ہے۔ منڈی ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم، مچھی ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم، ہیرا کنڈ ڈیم، دامودر ویلی ڈیم، کوسی بند، تنگ بھدرا بند، ماچکنڈ ہائیڈرو الیکٹر پروجیکٹ، کاکرا پار منصوبہ، میوراکشی ریز روائر سسٹم، کرشنا، پنار منصوبہ، چمبل پروجیکٹ، ہیری پار پروجیکٹ، ریہند بند، جمنا بند اور ناگار جن ساگر بند وغیرہ ان کثیر المقاصد پروجیکٹس کی مثالیں ہیں جن سے بجلی اور آبپاشی کے لیے پانی دستیاب ہوتا ہے اور ہماری زراعتی پیداوار پر اچھا اثر پڑتا ہے۔

انسان کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ وہ چاند اور دوسرے سیاروں کو چھو لے۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر اور دیگر ہوائی مشینوں کے سہارے وہ آسمان کی بلندیوں کو چھوتا رہا ہے مگر یہ جاننے کی خواہش کہ خلا (Space) میں کیا ہے؟ اور اس کے آگے بھی کیا ہے؟ اس خواہش نے سٹلائٹ کو جنم دیا جس کے سہارے وہ چاند اور دوسرے سیاروں کی طرف بڑھنے لگا۔ چاند پر تو اس نے قدم بھی رکھ دیے اور مارس کی طرف بھی گامزن ہونے کی خواہش کرنے لگا۔ اس طرح انسان اپنی انتھک کاوشوں سے سائنسی ترقیات کو عملی جامہ پہناتا رہا اور نہ صرف زمین کا ہی فاتح بنا بلکہ خلا اور سیاروں تک بھی اس کی رسائی ہوگئی۔

جدید سائنس نے ہمیں ریموٹ سنسنگ جیسی ٹکنالوجی عطا کی جس سے زمین کے اوپر یا زمین کے نیچے چھپے ہوئے قدرت کے خزانوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ پانی کے ذخائر کا علم ہو جاتا ہے اور معدنیات کا علم بغیر زمین کو کھودے ہوئے ہو جاتا ہے۔ ریموٹ سنسنگ تکنیک کو خلا سے یا بہت اونچائی سے مخصوص کیمروں کی مدد سے استعمال کیا جاتا ہے۔ زمین کے اوپر پہاڑوں پر یا زمین کے اندر جو بھی قدرتی خزانے چھپے ہیں، عکس ریز کے ذریعے یہ کیمرے اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ بعد میں فلم کو ڈیولپ کر کے ان جگہوں کی نشان دہی کر لی جاتی ہے۔ زمین کے اندر پیٹرولیم کے ذخیروں کا پتہ بھی ریموٹ سنسنگ کے ذریعے مل جاتا ہے۔

ابھی حال ہی میں Modern Genetic Engineers نے کلوننگ تکنیک ایجاد کی ہے جس سے ہم شکل جاندار پیدا کیا جا سکتا ہے۔ 1966 میں ڈولی نام کی بھیڑ کو کلوننگ کے ذریعے جنم دیا گیا اور بعد میں امریکہ کی ٹکساس ریاست میں ایک گائے کو بھی کلوننگ کے ذریعے جنم دیا گیا۔ اس کامیابی کے بعد اب سائنس داں انسانی کلون بنانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

RNA اور DNA اور ان کے Permutation اور Combination آف جینس کے ذریعہ من چاہی نئی زندگی پیدا کی جا سکتی ہے جس کی شکل وصورت، عادات واطوار اور آواز وغیرہ بالکل اسی طرح کی ہوگی جس کا کلون بنایا گیا ہے۔

سائنس کی ترقی اور انسانی زندگی کا تال میل وہیں تک قائم رہتا ہے جہاں تک سائنس کا استعمال انسانی زندگی کی بقا اور ترقی کے لیے ہو۔ جہاں یہ تال میل بگڑا، وہیں زوال شروع ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایٹم کا استعمال اگر پرامن مقاصد کے لیے کیا جائے تو انسانی زندگی کو آرام، آسائش اور ترقیات ملتی ہیں۔ لیکن یہی ایٹم اگر تباہی کے لیے بم کی شکل میں آجائے تو تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ فضا میں ایٹمی کثافت اس حد تک بھر جاتی ہے کہ آنے والی نسلیں ان سے متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ جیسے ہیروشما اور ناگاساکی کے لوگ آج تک ایٹمی اثرات سے جسمانی اور ذہنی طور سے اپاہج پیدا ہو رہے ہیں۔

الیکٹرونک سامان لوگ اس حد تک استعمال کرنے لگے ہیں کہ اسی پر منحصر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ٹی۔ وی۔ سی۔ آر۔ کیبل وغیرہ پر لوگ ہر وقت مشغول رہتے ہیں۔ اس سے ان کی آنکھوں کی بینائی پر تو برا اثر پڑتا ہی ہے وہ لوگ سماجی میل جول سے بھی دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کتابوں اور پڑھائی سے رغبت ختم ہونے لگتی ہے اور نتیجے کے طور پر وہ لوگ اپنے ہی تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔

سائنس کی ترقی انسانی بقا کی ضامن ہے۔ اس کا بہتر استعمال کیجیے اور پھر دیکھیے کہ سائنس اور اس کے عطیات آپ کو زندگی کی ڈگر پر کتنی تیزی سے آگے لے جائیں گے۔

□□□

پتہ:
46- Nishat Apartments
(Near Shamshad Market, AMU)
Aligarh, (U. P.)-202002

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روز مرہ کی زندگی رسم ورواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: 216 روپے

سید اطہر رضا بلگرامی

بین الاقوامی تجارتی تنظیم اور ہندوستان

بین الاقوامی تجارتی تنظیم [W.T.O] کا تعلق عالمی سطح پر زرعی و صنعتی تجارت کے آزادانہ فروغ کی کوششوں سے ہے۔ ہندوستان اپنے معاشی اصلاحی پروگراموں کے ساتھ اس تنظیم سے وابستہ ہے۔

1991 سے جاری ہندوستان کے معاشی اصلاحی پروگراموں کا بنیادی مقصد معیشت کو عالمی سطح پر مسابقتی اہلیتوں کی حامل بنانا ہے۔ W.T.O سے وابستہ ہو کر ہندوستانی معیشت عالمی معیشتوں سے جڑ گئی اور گلوبل مسابقت کے دائرے میں آ گئی۔ یہ معاشی آزادی اور کھلے پن کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ یعنی اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ مروّجہ کنٹرول اور سرکاری مداخلتوں کو کم کیا جائے، کوٹا اور لائسنس جیسی بندشوں کو ڈھیلا کیا جائے، چاروں طرف پھیلے ہوئے تحفظی حصاروں کو توڑا جائے اور اس طرح پیداوار اور تجارت کے میدانوں میں سرکاری بالادستیوں کی بجائے بازار کی آزادانہ شمولیت اور فیصلوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جائے۔

معاشی اصلاحی اقدامات میں سب سے پیچیدہ 'الجھے ہوئے' طویل مذاکرات میں گھرے عدم مصالحت کے شکار اور مختلف النوع تنقیدوں کا ہدف بننے والے اگر کوئی اقدامات ہیں وہ زراعت، زرعی تجارت اور بین الاقوامی تجارت کے فروغ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا مرکز W.T.O ہے۔ یہ تنظیم اپنے قیام سے ہی تنقیدوں کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ متعدد نشستوں میں ممبر ممالک کی زرعی تجارت اور بین الاقوامی تجارت کے مختلف پہلوؤں پر طویل مباحثوں کے باوجود کسی مفاہمتی و مصالحتی سطح تک پہنچنے میں ناکامی اس کی پہچان بن چکی ہے۔

تمام ممالک کے سامنے ایک واضح مقصد ہوتے ہوئے ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ٹکراؤ کن باتوں پر ہے اور ان کے پیچھے کیا فکر کام کر رہی ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب پالیسیوں، قوانین کی دفعات کی تشریحات و توضیحات اور تکنیکی پیچیدگیوں میں نہ تلاش کیجیے بلکہ ان کے پس پشت کارفرما نیتوں میں تلاش کیجیے۔ یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام ممالک کی معیشتیں مساوی سطح پر نہیں ہیں اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آزادی اور کھلے پن کے نام پر تمام کمزور معیشتیں اپنی خصوصی شناخت کھونا پسند نہیں کرتیں۔ وہ کھلے پن میں بھی اپنی پہچان کو برقرار رکھ کر اسی کو ترقی کی اساس بنانا چاہتی ہیں۔ اس معاملے میں یہ معیشتیں زیادہ حساس اور اقدار پسند ہیں۔ ان کو یہ احساس ہے کہ اقتصادی سطحوں کی ناہمواری انھیں مضبوط معاشی سربراہوں کا ہمسر تو نہیں، اطاعت گزار ضرور بنا دے گی۔ وہ اپنی اہلیت، صلاحیت، کوتاہیوں اور کمزوریوں کا محاسبہ کرتے ہوئے اس اندیشے میں مبتلا ہیں کہ ان معیشتوں کے ہمسر بننے کی مدت طویل اور اطاعت گزار بنے رہنے کی عمر لمبی ہے اور قوی قیاس یہی ہے کہ یہ اطاعت گزاری ہی ان کی مستقل پہچان بن کر رہ جائے گی۔ دل و دماغ میں پلنے والا یہی اندیشہ ناکامیاب نشستوں کی بنیاد ہے۔

عالمی معیشتوں کی ترقیاتی روشوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس تنظیم نے یہی چاہا کہ تمام ترقی پذیر معیشتیں کنٹرول، پابندیوں، سہاروں اور تحفظی حصاروں سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں بازار کی طاقتوں کے زیر نگرانی اور ان کے حسب ہدایت پیداوار و تجارت کو فروغ دیں۔ یہ عالمی تجارت اور پیداوار کے نظم و نسق کے نئے دور کا آغاز ہوگا۔ سب سے پہلے عالمی تجارت کے فروغ کے سلسلے میں مختلف ممالک میں لگائی جانے والی محصولی و غیر محصولی رکاوٹوں (Tariff and non-tariff barriers) کا باریک بینی سے تفصیلی جائزہ لیا گیا تاکہ عرصۂ دراز سے کسی بندھی تجارت کو آزاد کیا جا سکے۔ پھر اس آزاد فضا میں تجارت کے ایسے نئے میدان بھی تلاش کیے گئے جو ابھی تک تجارتی سرگرمیوں میں شامل نہیں تھے۔ زراعت، زرعی صنعتیں، خدمات، ٹکسٹائل ایسے ہی نئے میدان ہیں۔ ان نئے میدانوں کی شمولیت سے تجارت کے میدان وسیع ہوں گے، عالمی بازاروں میں وسعت پیدا ہوگی، استحکام آئے گا۔

تجارتی نظام العمل مرتب کرنے کے لیے تجارتی انوسٹمنٹ اقدامات (Trade Related Investment Measures) اور تجارت کے متعلق انٹلکچول پراپرٹی رائٹ (Trade Related Intellectual Property) جسے عرف عام میں "پیٹنٹ" کہا جاتا ہے زیر بحث لائے گئے اور مصالحتی گفت و شنید شروع کی گئی۔ پیداوار کے مختلف میدانوں اور ان کی مختلف سطحوں پر کس طرح پابندیوں کو ہٹایا جائے گا، یک مشت، قسطوں میں یا درجہ بندی کے ذریعے اور کس طرح بیرونی کمپنیوں کے آزادانہ انوسٹمنٹ کو فروغ دیا جائے گا؟۔ پھر اشیا کے پیٹنٹ کی نوعیت کیا ہوگی، کون، کون سی اشیا

پیٹنٹ کے دائرے میں لائی جائیں گی، پیٹنٹ کے اختیارات کیا ہوں گے، اس کے دوررس نتائج کیا ہوں گے؟ ان تمام سوالوں پر سرگرم بحث ومباحثہ کے باوجود اب تک کسی آخری نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکا ہے۔ زرعی سیکٹر میں جن اہم اقدامات کی سفارشات کی گئیں ان میں زرعی وسائل سے جڑی رعایتوں (Subsidies) میں تخفیف، پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم (P.D.S) کا خاتمہ، برآمداتی رعایتوں (Export Subsidies) اور برآمدی وغیر برآمدی محصول (Export and non-Export Tariff) جیسی رکاوٹوں کا خاتمہ اور بیرونی معتبر کمپنیوں کو زرعی بازاروں اور زرعی تجارت میں شمولیت کی فراخ دلانہ سہولتیں شامل ہیں۔ یہ ایسے اقدامات ہیں جن پر عمل درآمد سے زرعی سیکٹر کی شکل وصورت ہی بدل کر رہ جائے گی۔ ان تجویزوں کے مکمل نفاذ کا اثر ہندوستان کے عظیم زرعی سیکٹر، اس سے جڑی صنعتوں، گھریلو صنعتوں اور زراعت سے وابستہ نئے تجارتی امکانات پر کیا ہوگا، یہ کچھ اہم سوال ہیں جو مفکرین کے درمیان زیر بحث ہیں۔ چند نمایاں موافق وغیر موافق نظریات اس طرح ہیں۔

موافق نظریات: عالمی بینک کے ماہرین اقتصادیات اور ترقی یافتہ ممالک کے اقتصادی ماہرین اور عالمی کارپوریٹ سیکٹر کے سربراہ WTO کے نظریات کی حمایت اور اس کی فکر کی تبلیغ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہندوستان جیسی معیشتوں کے تجارتی وزرعی سیکٹر اور زرعی صنعتیں WTO سے وابستگی اور اس کی قراردادوں کی قبولیت کے بعد فروغ پائیں گی اور مجموعی معاشی صورت حال میں تیزی سے مثبت تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ وہ اپنے موقف کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

عصر حاضر میں سائنس اور ٹکنالوجی سے وابستہ علم وآگاہی اس سرعت سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اب علم وآگاہی پر مبنی پیداوار اور مادی وسائل پر مبنی پیداوار کے درمیان فرق کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آج کی دنیا میں پیداوار وتجارت کا نظم ونسق جس انداز میں ابھر رہا ہے اس میں ٹکنالوجی اور علم وآگاہی کی سطح تقابلی منفعت طے کرنے والے عوامل بن چکے ہیں اور روایتی عوامل مثلاً محنت، اجرت، خام مال کی دستیابی پیچھے ہوتے جارہے ہیں۔ حال اور مستقبل میں سائنس اور ٹکنالوجی سے وابستہ جدید تر آگاہی کی نئی نئی سمتیں اور ان کی مسلسل تلاش وجستجو ہی ممالک کی مسابقتی اہلیت کو طے کرے گی۔ وقت کی اس اہم ضرورت پر اگر ترقی پذیر ممالک نے لبیک نہ کہا اور وقت کی اس پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے خول میں محصور رہے، اپنے بنائے تحفظی حصاروں پر تکیہ کیے رہے اور الگ تھلگ رہ کر اپنے خودساختہ ترقیاتی منصوبوں پر منحصر رہے تو کسی طور سے معاشی استحکام حاصل نہ کر سکیں گے اور نہ اپنے پیچیدہ معاشی مسائل کا کوئی موثر حل تلاش کر سکیں گے۔ وقت کے تقاضوں پر لبیک نہ کہنا تیزی سے پیچھے گرتے رہنے کے مترادف ہوگا۔

ہندوستان کا زرعی سیکٹر معیشت کا سب سے بڑا اور بنیادی اہمیت کا حامل سیکٹر ہے لیکن وہی سب سے پچھڑا، انتہائی غیر معتبر اور دیگر سیکٹروں سے الگ تھلگ ہے۔ یہ محض روایتی پیداوار کے ذریعے اپنی پہچان بنائے ہوئے ہے۔ اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو نہ تو ابھرنے کا موقعہ ملا ہے اور نہ ان سے پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ WTO سے منسلک ہوکر اور اس کی سفارشات پر عمل پیرا ہوکر بیرونی کمپنیوں کے بڑے پیمانے پر انوسٹمنٹ سے اس پچھڑے سیکٹر کے خدوخال سرعت سے بدل جائیں گے۔ یہ کمپنیاں جدید ٹکنالوجی کے ساتھ زراعت، صنعت اور تجارت میں انقلاب لے آئیں گے۔ جدید ٹکنالوجی اور آرگینک زرعی پیداوار کے ذریعے نہ صرف پیداوار کی روایتی عدم اعتمادی ختم ہوگی بلکہ پیداوار کے نئے میدانوں کی شمولیت پیداوار کی سطح کو بلند، بازاروں کو وسیع اور بیرونی تجارت کو فروغ دے گی۔ یہ کامیاب مظاہر ملکی کمپنیوں کے شوق وتجسس کو ہوا دیں گے۔ ملکی کمپنیاں جو اب تک اس سیکٹر میں انوسٹمنٹ کو گھاٹے کا سودا سمجھتی تھیں بیرونی کمپنیوں کی منافع بخش عملی سرگرمیوں سے متاثر ہوکر آگے بڑھیں گی اور ان کے اشتراک وتعاون سے روایتی زرعی سیکٹر کو بڑے تجارتی سیکٹر میں تبدیل کر دیں گی۔ پھولوں کی کاشت، ریشم کی کاشت، باغبانی، ترکاریوں اور پھلوں سے وابستہ صنعتیں، وہ نئی سرگرمیاں ہیں جو روایتی پیداوار کے ساتھ مل کر روزگار کے مواقع وسیع کریں گی، کام کرنے کے انداز (Work Culture) اور سوچ کو بدلیں گی اور اس پچھڑے سیکٹر کو نہ صرف معیشت کے دیگر سیکٹر سے بلکہ تجارت کے سہارے دنیا کی معیشتوں سے جوڑیں گی۔ جو خواب ہم اپنے منصوبوں میں دیکھتے آئے ہیں، اس کو بیرونی انوسٹمنٹ اور کھلا پن پورا کرے گا۔

ابتدا سے ہی منصوبہ بند ترقی کے انداز نے کمزور اور غریب طبقوں اور معاشی اعتبار سے غیر محفوظ اور پس ماندہ سیکٹر کو ایک تحفظی حصار میں محصور رکھا ہے۔ ان کے لیے ہر طرح کی رعایتیں، سہولتیں، امداد، چھوٹ، سہارے اور پشت پناہیاں جائز سمجھی گئی ہیں۔ لیکن ان تمام تحفظی حصاروں، سہاروں اور سہولتوں نے ان کو، بالخصوص دیہی سیکٹر کے بڑے غریب طبقے کو، فائدے کے

بجائے نقصان ہی پہنچایا ہے۔ وہ سہاروں کے ذریعے ہی آگے بڑھنے کے عادی بنے، ان میں خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی نہ صلاحیت ابھری اور نہ امنگ اور جستجو۔ جدو جہد، مسابقت، نئی تکنیک کی تلاش کا جذبہ، آگاہی ان چیزوں کی اہمیت پس پشت ڈال دی گئی۔ پھر ان رعایتوں، سہاروں اور امدادوں نے معیشت کے بجٹ کو گھاٹے کی طرف ڈھکیل دیا اور گھاٹے میں ہر سال اضافہ اس کی مستقل پہچان بن گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ ہم زرعی سیکٹر جیسے بنیادی معاشی ستون کو مضبوط کر سکے اور نہ معیشت کو کبھی نہ لوٹنے والے افراط زر کے پھندوں سے نکال سکے۔

کھلی اور آزاد معیشتوں میں بیرونی معتبر کمپنیاں اپنے کام کرنے کے انداز اور انوسٹمنٹ کی حکمت عملی کے ذریعے ملکی انوسٹرس اور بیشتر زرعی آبادی کے لیے کشش و ترغیب کا باعث بنیں گی۔ اس تنظیم نے رعایتوں میں تخفیف کی جو شرح تجویز کی ہے، ہندوستان اس سے باہر ہے۔ یعنی، ہندوستان جس شرح پر زرعی رعایتیں بجلی، آبپاشی، کھاد، قرض، بیج کے سلسلے میں دے رہا ہے وہ تجویز شدہ شرح تخفیف سے کم ہیں اس لیے یہ رعایتیں ابھی جاری ہیں۔ لیکن مستقبل میں ان رعایتوں کو ختم ہونا ہے۔ ''پیٹنٹ'' بھی ایک تجارتی تحفظی حصار ہی ہے جس کے لیے نئے اور مضبوط قوانین کی ضرورت ہوگی جن کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ جب تک نئے قوانین کے ذریعے ہم اپنی زرعی اشیا اور ان سے وابستہ تجارتی اشیا کو پیٹنٹ رائٹ کے تحفظی حصار میں نہیں لے لیتے ان تمام اشیا کی پیداوار و تجارت ہمارے ہاتھ سے نکل سکتی ہے، باسمتی چاول، نیم اور ہلدی پر اٹھائے گئے سوالات اور ان پر دوسرے ممالک کی دعوے داری خطرے کی گھنٹی ہیں۔ یقیناً ہمارے قوانین کی کمزوری اور ریسرچ اور کھوج کی پس ماندگی دوسروں کو استحصال کا موقعہ فراہم کر سکتی ہے۔

غیر موافق خیالات: بغیر اس کا لحاظ کیے کہ تمام ممالک کی معیشتوں کی سطح، ان کی استعداد و اہلیت کا کیا معیار ہے، آیا وہ کسی حد تک مساوی ہیں یا نہیں، تمام بندشوں اور پابندیوں کو مسترد کرنے کی پُر زور وکالت، دی جانے والی تمام رعایتوں، سہاروں اور تحفظی حصاروں کو اصولاً نہ صرف ترقی کی راہ کی اڑچنیں سمجھنا بلکہ ان کو معیشت پر غیر ضروری اور ضرر رساں بوجھ یقین کرنا، ایک خاص مکتب فکر اور زاویۂ نگاہ کی وکالت ہے جو اپنی فکر کے عملی نفاذ کو مقدم اور ہمارے مروجہ نظام کی کمزوریوں کی اصلاح کو غیر اہم سمجھتا ہے۔ ہماری اصلاح احوالی کو نئے نظام کی پذیرائی سے مشروط کیا جا رہا ہے۔ تمام پابندیوں اور تحفظی حصاروں کو ختم کر کے معیشتوں کو آزاد اور کھلا بنانے کا کیا مطلب ہے۔ یہی نا کہ دنیا کے بہتر سے بہتر مواقع ہمارے لیے کھلے ہیں۔ لیکن یہ کیوں فراموش کر دیا جاتا ہے کہ دوسرے جو ہم سے کہیں زیادہ اہل ہیں ان کے لیے بھی ہماری معاشی نعمتوں کے دروازے کھولے جا رہے ہیں۔ اب اگر یہ سمجھایا جاتا ہے کہ اس کھلے پن سے جتنا فائدہ اٹھا سکتے ہو اٹھاؤ اور دوسروں کو بھی اٹھانے دو تو غور کیجیے کس کا پلہ بھاری رہے گا۔

ہم کو اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں، صلاحیتوں اور اہلیتوں کا بخوبی احساس ہے اور دوسروں کو بھی ہے۔ ہم کس کے سامنے اپنے آپ کو کھول کر کھڑا کر رہے ہیں۔ ان تجویزوں پر عمل درآمد چند مستحکم معیشتوں کو سربراہی عطا کرے گی اور بیشتر ترقی پذیر معیشتوں کو مہذب اطاعت گزاری۔ موجودہ صورت حال تو یہ ہے کہ دنیا کی کل برآمدات میں ہندوستان کا حصہ ایک فی صد بھی نہیں ہے۔ 2001 تا 2004 یہ حصہ محض 7 تا 8 فی صد رہا۔ زرعی میدان جس کو معاشی اصلاحوں کی آماجگاہ بنایا جا رہا ہے، اس کی صورت حال یہ ہے کہ آج دنیا کے 3 تا 6 بڑے کارپوریٹ تاجر کل عالمی گیہوں کی تجارت کے 58 تا 90 فی صد، چاول کی تجارت کے 70 فی صد، شکر کی تجارت کے 60 فی صد، کافی، کپاس، تمباکو اور جوٹ کی تجارت کے 58 تا 90 فی صد اور اناس اور جنگلات کی پیداوار کے 90 فی صد حصے پر قابض ہیں (2)۔ آپ کن مستند صلاحیتوں کے سامنے اپنے آپ کو مسابقت کے لیے تیار کر رہے ہیں اور وہ بھی اپنے تمام ''ہتھیاروں'' سے دست بردار ہو کر۔ آپ کتنے عرصے کی انتھک جدو جہد کے بعد ان بڑی معیشتوں کے ہم رکاب ہو پائیں گے اور کب تک وہ ہماری ہم رکابی قبول کریں گے، لمحۂ فکریہ ہے۔ اس کے لیے تو ہم کو ہر محاذ پر منفعت بخش تاجرانہ ذہنیت اور چاق و چوبند حکمتِ عملیوں سے لیس ہونا پڑے گا۔ اس ماحول میں ترقی کا مطلب منافع بخش کارگزاریاں ہی ہیں۔ یہاں اگر ترقیاتی سرگرمیوں میں ایک فی صد بھی منافع میں گراوٹ کا احساس ہوا تو متعلقہ نظام کو محتاط ہونا پڑے گا، حکمتِ عملی پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوگی۔ کیا ہم اس کے اہل ہیں؟

□□□

پتہ:
B-4, Johri Farm,
Okhla New Delhi -110025

ایم نسیم اعظمی

مینجمنٹ اَپٹی ٹیوڈ ٹیسٹ (MAT)

یہ مقابلے کا دور ہے اور اس میں وہی شخص کامیابی حاصل کرسکتا ہے جو اپنی اہلیت ثابت کرسکے۔ مینجمنٹ کورس میں داخلے کے لیے کیٹ کے علاوہ اب میٹ (MAT) بھی کافی اہمیت اختیار کرچکا ہے۔ میٹ کا امتحان "آل انڈیا مینجمنٹ ایسوسی ایشن" (AIMA) کے زیر اہتمام منعقد کیا جاتا ہے اور یہ امتحان سال میں چار بار فروری، مئی، ستمبر اور دسمبر میں ہوتا ہے۔ اس میں کامیابی کے بعد ہندوستان بھر میں قائم تقریباً ایک سو بیس (120) اہم بزنس اسکولوں میں داخلے لیے جاسکتے ہیں اور مینجمنٹ کی تعلیم کے حصول کے بعد اس شعبے میں بہتر کیریئر بنایا جاسکتا ہے۔

گلوبلائزیشن نے ساری دنیا میں جس صارفی کلچر کو فروغ دیا ہے اس میں وہی شخص کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے جو موجودہ دور کے حالات و ماحول اور طریقۂ کار کی بخوبی جانکاری رکھتا ہو اور اس کے لیے کیٹ اور میٹ جیسے مقابلہ جاتی امتحانوں میں کامیابی ضروری ہے۔

اہلیت اور امتحان: میٹ میں شرکت کے لیے پچاس فیصد (50%) نمبروں سے گریجویشن پاس ہونا ضروری ہوتا ہے۔ گریجویشن کے آخری سال کے امتحان میں شریک ہونے والے طلبا بھی اس میں شرکت کے مجاز ہوتے ہیں۔ یہ امتحان کل دو سو (200) نمبروں کا ہوتا ہے اور سوال حل کرنے کا وقت ایک سو پچاس (150) منٹ یعنی ڈھائی گھنٹے۔ اس میں تقریباً سبھی سوالات معروضی (Objective) انداز کے ہوتے ہیں اور نگیٹیو مارکنگ کا بھی التزام ہوتا ہے یعنی غلط جواب پر ایک چوتھائی نمبر کاٹ لیے جاتے ہیں۔ اس امتحان میں ڈاٹا انٹرپریٹیشن، کوانٹیٹیو ایبلیٹی، لاجیکل اینڈ کریٹیکل ریزننگ اور عام معلومات وغیرہ سے متعلق سوالات پوچھے جاتے ہیں امتحانی پرچہ پانچ حصوں پر مشتمل ہوتا ہے ہر حصے میں تقریباً چالیس چالیس سوالات ہوتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

ریڈنگ کامپری ہنشن: اس حصے میں سوالات کا پہلا جز و انگریزی لینگویج کمپری ہنشن کا ہوتا ہے۔ میڈیم بھی انگریزی زبان ہی ہوتی ہے۔ اس لیے اس میں زیادہ نمبر حاصل کرنے کے لیے انگریزی زبان و ادب اور گرامر کی جانکاری ضروری ہے۔ اس کے لیے مجوزہ کتب کے علاوہ انگریزی اخبارات کا پابندی سے مطالعہ اور اہم خبروں کا کلکشن تیار کرتا اور اس کا اعادہ کرتے رہنا انتہائی سود مند ہوتا ہے۔ خصوصاً اقتصادیات، معاشیات، دوا سازی، سائنس، سماجی علوم اور تاریخ سے متعلق جانکاری اور کرنٹ افیئر کے بارے میں اچھی واقفیت مفید ہوتی ہے۔ اس حصے میں عموماً بڑے بڑے اقتباسات دیے جاتے ہیں اور انھیں میں سے سوالات کیے جاتے ہیں۔ چونکہ عموماً عبارتیں بڑی ہوتی ہیں اس لیے انھیں بغور پوری پڑھنے میں وقت زیادہ صرف ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے اس لیے اس بات کا خاص دھیان رکھنا چاہیے کہ عبارتیں پوری نہ پڑھ کر اس کے اہم نکات کو ہی سمجھنے کی کوشش کی جائے اور انھیں کی بنیاد پر کم سے کم وقت میں جوابات دے کر وقت کی بچت کی جائے۔ مگر اس قسم کے سوالات میں عموماً دو قسم کی غلطیوں کا امکان ہوتا ہے (1) کیلکولیشن مسٹیک (غلط شماری) (2) سلکشن پرابلم (انتخابی مسئلہ)۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وقت کی کمی کے باعث بعض سوالات کے جوابات معلوم ہونے کے باوجود طلبا لکھ نہیں پاتے ہیں۔ اس سے بچنے کے لیے پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ سبھی سوالات پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے اور اپنے اوپر کسی بھی حالت میں سوالات کی زیادتی اور وقت کی کمی کے احساس کو حاوی نہ ہونے دیا جائے۔ پورے وثوق و اعتماد سے اپنی اہلیت و صلاحیت کا صحیح مظاہرہ کر کے اپنی کامیابی کو یقینی بنایا جائے۔

کوانٹیٹیو ایبلٹی: میٹ کا دوسرا حصہ ریاضی سے متعلق ہوتا ہے۔ اس میں تقریباً پندرہ فیصد (15%) سوالات عام ریاضی کے ہوتے ہیں جو عموماً ہائی اسکول معیار کے سوالات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مثلاً فیصد، نفع، نقصان، عام سود، سود در سود، تناسب اور مساوی تناسب کے سوالات۔ تقریباً دس فیصد (10%) سوالات جیومٹری، ہندسہ اور مینو ایشن وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ بقیہ سوالات بھی اسی قسم کے ہوتے ہیں جو ہائی اسکول یا انٹر معیار کی ریاضی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس حصہ کے سوالات حل کرتے وقت خصوصی توجہ اور ہوشیاری درکار ہوتی ہے کیونکہ آسان سوالات بھی کافی گھما پھرا کر اور پیچیدہ بنا کر کیے جاتے ہیں۔ ذرا سی کم توجہی اور بے خیالی سے غلطیوں کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ بنیادی ریاضی کی بہتر جانکاری، اصول اور فارمولے کی عملی مشق اور اعادے سے طلبا بہتر مظاہرہ کر سکتے ہیں اس لیے کہ یہ سوالات بہ ظاہر جتنے مشکل اور پیچیدہ دکھائی دیتے ہیں در اصل ویسے ہوتے نہیں ہیں

یہاں صرف طلبا کی یادداشت، حاضر جوابی، زود فہمی، سرعت فیصلہ اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کی صلاحیت کا اندازہ اور آزمائش مقصود ہوتی ہے۔

ڈاٹا انالسس شفی اینسی: تیسرے حصے میں ڈاٹا شفی اینسی، لاجیکل ریزننگ، ڈاٹا انٹر پری ٹیشن اور ڈاٹا کمپریزن کے سوالات ہوتے ہیں جن میں عموماً پچیس فیصد (25%) سوالات ڈاٹا شفی اینسی کے اور باقی سوالات ڈاٹا انٹر پریٹیشن، ڈاٹا کمپریزن اور لاجیکل ریزننگ سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس حصے میں ریاضی کی بہتر جانکاری کے ساتھ ساتھ منطقی استدلال اور وربل اور نان وربل کی نفسیات کی جانکاری کارآمد ہوتی ہے۔

ان ٹیلی جنس اور کری ٹیکل ریزننگ: میٹ کے پرچے کا یہ چوتھا حصہ ہوتا ہے جس میں کل چالیس (40) سوالات ہوتے ہیں جو انالیٹیکل ریزننگ، لاجیکل ریزننگ اور ڈاٹا انالسس کے موضوع سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ حصہ حاضر جوابی، تیز دماغی، باریک بینی، نکتہ سنجی اور فوری قوت فیصلہ کا طالب ہوتا ہے۔ سوالات حل کرتے وقت طلبا کو مذکورہ باتوں کا دھیان رکھنے اور سائنٹفک انداز اپنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

عام معلومات: میٹ امتحان کا یہ پانچواں اور آخری حصہ ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ تر ملکی اور غیر ملکی تجارت و معاشریات اور حالات و واقعات سے متعلق سوالات کیے جاتے ہیں لہٰذا اس کی تیاری کے لیے بزنس، ٹریڈ، مارکیٹنگ، اقتصادیات، کرنٹ افیئر اور کرنٹ اکنامی سے متعلق کتب و رسائل اور اخبارات وغیرہ کا مطالعہ اہم اور ضروری ہوتا ہے اس کے علاوہ مذکورہ موضوعات پر مشتمل اہم اور ضروری اطلاعوں کا انتخاب کر کے ان کا اعادہ کرتے رہنا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ انگریزی، ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں بہت سے ایسے رسائل نکلتے ہیں جو اس میں معاون ہوتے ہیں۔ اردو زبان میں ماہنامہ ''یوجنا'' ''اردو دنیا'' اور صنعت و حرفت سے متعلق دیگر رسائل و اخبارات کے مذکورہ موضوعات پر شائع ہونے والے مضامین کارآمد ہوتے ہیں۔

میٹ کے اس پانچویں اور آخری حصے کی اہمیت اس لیے بھی ہوتی ہے کہ اس کے نمبر انٹرویو میں بھی کاؤنٹ کیے جاتے ہیں۔ اس لیے پورے پرچے پر انتہائی توجہ دینے اور ہشیاری سے جوابات دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

میٹ امتحان میں شرکت کی تیاری کرتے وقت سوالات کے پانچوں حصوں کی تیاری مکمل طور پر کرنا چاہیے اور پوری خود اعتمادی اور اطمینان و یقین کے ساتھ امتحان میں شریک ہونا چاہیے۔ اگر کوئی امیدوار پہلی بار امتحان میں شریک ہو رہا ہے اور کسی ایک حصے کی تیاری مکمل یا اطمینان بخش نہیں تب بھی امتحان میں اسے شرکت ضرور کرنی چاہیے تاکہ اپنی کمیوں کا اندازہ کر کے آئندہ کامیابی سے ہمکنار ہونے کی راہ ہموار کر سکے۔ پہلی بار کی ناکامی سے نہ تو مایوس ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی پست ہمت ہونے کی۔ یہ امتحان سال میں چار بار ہوتا ہے اور عموماً پہلی یا دوسری بار کی ناکامی آئندہ کی شاندار کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

میٹ کی تیاری کرتے وقت طلبا عموماً چار یا پانچ چیپٹر کو ہی اہمیت دیتے ہیں جس سے تیاری کا توازن برقرار نہیں رہ پاتا اور نتیجہ عموماً ناکامی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس لیے کسی کو اہم اور کسی کو کم اہم سمجھنے کے بجائے مکمل تیاری کرنی چاہیے کیونکہ سوالات کہیں سے بھی پوچھے جا سکتے ہیں۔ میٹریل کو بغور اور بار بار پڑھنے، سمجھنے، عملی مشق اور اس کے اعادہ کرنے کے ساتھ ہی امتحان میں شریک ہونے سے قبل کم از کم پانچ بار سلف ٹسٹ کر کے اپنے طور پر مطمئن ہو لینا بہتر اور مفید ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مکمل تیاری پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کی جائے۔

□□□

پتہ:
Domanpura
Kasari, Mau Nath Bhanjan,
(U.P.) 275101

ہمارا ای میل آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' سے خط و کتابت
بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

وحید الحق

مرزا خلیل احمد بیگ سے گفتگو

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ ماہر لسانیات ہونے کے علاوہ اردو کے ممتاز نقاد اور محقق ہیں۔ ان کی تحریروں سے ان کی تنقیدی اور تحقیقی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خلیل بیگ صاحب کی پیدائش یکم جنوری 1945 کو گورکھپور میں ہوئی۔ بیگ صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے 1964 میں علی گڑھ آئے اور پھر یہیں کے ہوگئے۔ B.A. اور M.A. کے بعد پروفیسر مسعود حسین خاں کی نگرانی میں "Historical Grammar of Urdu of North India" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ انگریزی میں لکھا جس پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں 1975 میں پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری تفویض کی۔ اس مقالے میں اردو زبان کی قواعد میں عہد بہ عہد رونما ہونے والی تبدیلیوں کا لسانیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بعد میں اس مقالے کو دہلی کے ایک پبلشر نے "Urdu Grammar: History and Structure" کے نام سے شائع کیا۔ پی. ایچ. ڈی. مکمل کرنے کے بعد شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 1973 میں لکچرر ہوگئے اور اسی شعبے سے سبک دوش ہوئے۔ بیگ صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے ہوا، لیکن ان کی دلچسپی کا اصل میدان لسانی تنقید و تحقیق ہے۔ "زبان، اسلوب اور اسلوبیات" ان کی پہلی تصنیف ہے جو 1982 میں شائع ہوئی۔ خلیل بیگ صاحب خود کو علمی کاموں میں مصروف رکھتے ہیں۔ پہلے بھی تواتر کے ساتھ ان کے مضامین رسائل و جرائد میں شائع ہوتے تھے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ انھیں کئی انعامات اور اعزازات مل چکے ہیں جن میں اتر پردیش اردو اکادمی کا انعام "زبان، اسلوب اور اسلوبیات" پر، بہار اردو اکادمی کا انعام "اردو کی لسانی تشکیل" پر، اور میر اکادمی کا انعام "پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی" پر شامل ہیں۔ پاکستان کا نقوش ایوارڈ "اردو میں لسانی تحقیق" کے حوالے سے ملا۔ حال ہی میں ان کی ایک کتاب "ایک بھاشا... جو مسترد کردی گئی" کے نام سے شائع ہوئی ہے، جو کہ گیان چند جین کی متنازع فیہ تصنیف "ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب" کا رد ہے۔ اس کتاب میں گیان چند جین کے غلط لسانی رویوں، مفروضوں اور سوالوں کا سیر حاصل اور مدلل جواب دیا گیا ہے۔ پچھلے دنوں ان سے کی گئی گفتگو کے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

س: بیگ صاحب آپ نے طویل مدت تک لسانیات کا درس دیا ہے، میں یہ جاننا چاہوں گا کہ زبان کی جامع تعریف کیا ہوسکتی ہے؟

ج: زبان کی عام تعریف تو یہ ہے کہ زبان اظہار خیال کا ذریعہ ہے، یعنی زبان ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے توسط سے ہم اپنے جذبات، خیالات، احساسات اور محسوسات یا اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتے ہیں۔ لیکن لسانی اعتبار سے اگر آپ زبان کو دیکھیں تو Bloch and trager نے اس کی ایک مخصوص تعریف بھی پیش کی ہے، وہ کہتا ہے:

"Language is an arbitrary vocal symbol by means of which human beings co-ordinate"

یعنی زبان صوتی علامات کا ایسا مجموعہ ہے جو اختیاری ہے اور اس کے ذریعے انسان آپس میں ترسیل خیالات کا کام لیتے ہیں۔ اس میں دو تین چیزیں واضح ہیں مثلاً ہم اسی چیز کو زبان کہیں گے جس کا استعمال انسان سماجی ماحول میں اظہار خیال کے لیے کرتا ہے۔ یعنی تہذیبی طور پر وہ زبان سیکھتا ہے اور پھر اس کا استعمال کرتا ہے۔ باقی جتنے بھی ترسیل و ابلاغ کے طریقے ہیں وہ زبان کی تعریف میں شامل نہیں کیے جاسکتے۔ دوسری چیز جو زبان کی تعریف میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ زبان اصوات کا مجموعہ ہے۔ یعنی جب تک کہ ہم اپنے اعضائے تکلم کو حرکت نہ دیں اور ان کے ذریعے اصوات پیدا نہ کریں اس وقت تک زبان وجود میں نہیں آسکتی۔ تو لسانیاتی اصطلاح میں زبان کی ٹھیٹھ اور کھری تعریف یہ ہے کہ "زبان آوازوں کا مجموعہ ہے"۔

اسی طرح ہم تحریر کو زبان نہیں کہہ سکتے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "تحریر" کیا ہے؟ تو اس کا سادہ اور آسان جواب یہ ہے کہ تحریر زبان نہیں ہے بلکہ یہ زبان کی ترجمانی کرتی ہے۔ یعنی وہ چیز جو اصوات کی ترجمانی کرتی ہے اس کا نام تحریر ہے۔ تحریر کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے جبکہ اولیت تکلمی زبان کو حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے، جنھیں ہم ان پڑھ کہتے ہیں، ان کو بھی اپنی زبان پر قدرت حاصل ہے، وہ بھی اپنے خیالات کا

اظہار کر سکتے ہیں۔ ایک بچہ جس نے کہ ابھی لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا ہے، وہ بھی گفتگو کر سکتا ہے اور اپنی مادری زبان کے جملے بول سکتا ہے۔ تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زبان نہیں جانتا، وہ زبان تو جانتا ہے لیکن اس کا اظہار تحریری شکل میں نہیں کر سکتا۔ لکھنا پڑھنا چونکہ رسمی چیزیں ہیں اور جب تک آدمی رسمی طور پر اسکول نہ جائے لکھنا اور پڑھنا نہیں سیکھ سکتا۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ تحریر کو وہ حیثیت حاصل نہیں جو تکلمی زبان کو ہے۔ یعنی بنیادی حیثیت تکلمی زبان کو حاصل ہے۔

س: زبان کس طرح وجود میں آتی ہے؟

ج: زبان انسانی معاشرے میں وجود میں آتی ہے یعنی جس معاشرے میں انسان آنکھ کھولتا، سانس لیتا ہے اور پروان چڑھتا ہے وہ اسی معاشرے میں زبان سیکھتا ہے۔ زبان اکتسابی (Acquired) ہے یہ موروثی نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ ماں باپ جو زبان بولتے ہیں بچہ بھی وہی زبان بولے بلکہ معاشرہ جو زبان بولتا ہے بچہ اسی زبان کو سیکھتا ہے۔ اس کو آپ یوں سمجھیے کہ کسی اردو بولنے والے والدین کا کوئی بچہ ہے لیکن بچے کو اس کی پیدائش کے فوراً ہی بعد اگر لندن بھیج دیا جائے تو وہ بڑا ہو کر انگریزی بولے گا، اسی طرح اگر اس کو پیرس بھیج دیا جائے تو وہ وہیں کی زبان بولے گا یعنی وہ اردو نہیں بولے گا، جبکہ اس کے ماں باپ اردو بولتے تھے۔ تو بنیادی طور پر بچہ اسی معاشرے اور ماحول کی زبان سیکھتا ہے جس میں وہ آنکھ کھولتا ہے، اس سے قطع نظر کہ اس کے والدین کون سی زبان بولتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ زبان سیکھنے کی صلاحیت فطری طور پر انسان کو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔

اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر انسان کے پاس قوت گویائی موجود ہے اور یہ قوت گویائی خدا کی عطا کردہ ہے۔ یہ قوت گویائی غیر بشر یعنی جانوروں کو نہیں دی گئی ہے صرف انسان کو دی گئی ہے۔ اب اس صلاحیت اور قوت گویائی کو استعمال کرتے ہوئے وہ کون سی زبان سیکھتا اور بولتا ہے اس کا پورا دارومدار اس معاشرے اور تہذیبی ماحول پر ہے جس میں وہ بچپن سے سانس لے رہا ہے۔

س: زبان کی کتنی قسمیں ہوسکتی ہیں؟

ج: زبان کی کئی قسمیں کی گئی ہیں، ہیئت کے اعتبار سے، تاریخی اعتبار سے اور جغرافیائی اعتبار سے بھی قسمیں کی گئی ہیں۔

س: مثلاً ہم کہتے ہیں کہ اشاروں کی زبان ہوتی ہے۔

ج: اشاروں کی زبان، تکلمی زبان کی تعریف پر پوری نہیں اترتی، اس لیے کہ اشاروں کی زبان کو ہم انسانی زبان نہیں کہیں گے۔ انسانی زبان تو صرف وہ ہے جو انسانی اعضائے تکلم کو حرکت دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ اشاروں کی زبان کو ہم "Meta Language" کہیں گے، یعنی زبان کے پرے۔ دیکھیے، ترسیل کے کئی طریقے ہیں ان میں ایک طریقہ اشارہ بھی ہے، ایک طریقہ تحریر بھی ہے اور چند دوسری علامتیں بھی ہیں، لیکن اپنی بات کو کہنے کا سب سے مؤثر اور سب سے Delicated اور پیچیدہ طریقہ زبان ہے، باقی تمام چیزیں ثانوی ہیں اور ان کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہے جو انسانی زبان کو حاصل ہے، مثلاً جانور بھی ایک دوسرے سے Communicate کرتے ہیں اور اس کے لیے وہ مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں۔ لیکن اس کو ہم زبان نہیں کہیں گے، ہم اس کو ترسیل کا ایک طریقہ System of Communication کہیں گے۔ لیکن وہ پیچیدگی اور Delicacy جو انسانی زبان کے اندر ہے وہ اس System کے اندر نہیں ہے۔ لہٰذا زبان اظہار کا سب سے جامع طریقہ ہے جو صرف اور صرف انسان کو حاصل ہے۔

س: اگر زبان کی سطح پر بات کریں تو ایک ہی زبان کی دو مختلف شکلیں ہو جاتی ہیں یعنی ایک شکل تو عام بول چال اور کاروبار کی زبان ہوتی ہے جس سے ہم روزمرہ کے مقاصد پورے کرتے ہیں اور دوسری شکل ادبی زبان کی ہوتی ہے۔ واضح طور پر دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ از راہ کرم یہ بتانے کی زحمت کریں کہ آخر کس طرح عام بول چال کی زبان، ادب کی زبان میں تبدیل ہو جاتی ہے؟۔

ج: دیکھیے، زبان مختلف مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے، زبان سے ہم بہت سے کام لیتے ہیں۔ تو وہ زبان جس کا سیدھا اور راست استعمال ہوا سے عام بول چال کی زبان کہتے ہیں اور عام بول چال کی زبان میں ہم جو ترسیل و ابلاغ کرتے ہیں اس میں کسی طرح کا ابہام نہیں ہوتا یعنی لفظ اور معنی کا رشتہ راست ہوتا ہے، یعنی لفظوں کو ہم لغوی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ جیسے اگر ہم ''کتاب'' کہیں تو اس سے کتاب ہی مراد لی جائے گی جو چھپی ہوئی شکل میں ہوتی ہے۔ لیکن اگر شاعری کی زبان میں کتاب کا لفظ استعمال کریں تو اس کے معنی زندگی کے بھی ہو سکتے ہیں یا کسی دوسری چیز کے بھی ہو سکتے ہیں۔ تو عام بول چال کی زبان بالکل سیدھی سادی ہوتی ہے اس میں کسی طرح کا پیچ و خم نہیں ہوتا لیکن جب یہی زبان کسی ادبی مقصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے یعنی جب شعر و شاعری کے لیے استعمال کی جاتی ہے تو اس کی نوعیت بدل جاتی ہے، اس لیے کہ شاعری میں یا ادب میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہم کھلم کھلا

بیان نہیں کر سکتے اس کے لیے ہمیں کنایوں اور علامتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اچھی شاعری وہی سمجھی جاتی ہے جس میں بات علامتی انداز میں کہی گئی ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شاعری میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ راست نہیں ہوتی بلکہ ڈھکے چھپے انداز میں شاعر کوئی بات کہتا ہے اور جب بات اس طرح کہی جائے گی تو ظاہر ہے کہ زبان میں ترمیم کرنا پڑے گی یعنی اس کے نہج کو بدلنا ہوگا۔ جب ہم عام بول چال کی زبان کے Pattern کو بدلتے ہیں تو یہی زبان علامتی اور شعری زبان بن جاتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ شاعر یا ادیب جب کوئی بات کہتا ہے تو اس کی کوشش رہتی ہے کہ اس کے اسلوب میں ایک حسن پیدا ہو، اس کا اسلوب شگفتہ اور نکھرا ہوا ہو۔ لیکن یہ تمام چیزیں زبان کو راست انداز میں استعمال کرنے سے پیدا نہیں ہوسکتی ہیں۔

س: اردو کے لسانیاتی مطالعے کا آغاز کب اور کس طرح ہوا؟

ج: لسانیات تو ایک علم کا نام ہے جو زبان اور اس کے ارتقا کا ایک نظریہ پیش کرتا ہے۔ لسانیات کا ارتقا بیسویں صدی کے آغاز سے ہوا ہے۔ Ferdinand de Saussure کا نام آپ نے سنا ہوگا یہ فرانس کا ایک مشہور دانشور تھا، اس نے اپنے طالب علموں کے سامنے کچھ لیکچر دیے۔ 1913 میں اس کا انتقال ہوگیا، اس کے انتقال کے بعد 1916 میں اس کے Lectures کا مجموعہ "Course in General Linguistics" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب سے جدید لسانیات کا آغاز ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کے افکار چونکا دینے والے تھے اور اس سے پہلے کسی نے ایسے افکار پیش نہیں کیے تھے۔ اس سے پہلے زبان کا مطالعہ تاریخی تھا، دو زبانوں کا تقابل کیا کرتے تھے اور اس کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے تھے کہ دونوں زبانوں میں گہرا رشتہ ہے اور یہ کسی ایک ماخذ سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ یہ گویا زبانوں کا تاریخی مطالعہ تھا۔ 18ویں اور 19ویں صدی تک یورپ کے ماہر لسانیات تاریخی لسانیات کا مطالعہ کرتے رہے، لیکن 20ویں صدی سے زبانوں کے تاریخی مطالعے کے علی الرغم زبانوں کا توضیحی مطالعہ شروع ہوا یعنی Descriptive Linguistics کا آغاز ہوا۔ تاریخی لسانیات میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ زبانوں کا ارتقا کس طرح ہوا، زبانوں میں تبدیلیاں کس طرح رونما ہوئیں، زبانیں کس طرح وجود میں آئیں اور ایک زبان کا دوسری زبان سے کیا رشتہ ہے وغیرہ۔ لیکن جب توضیحی لسانیات کا آغاز ہوا تو ماضی میں بولی جانے والی زبانوں یا مردہ زبانوں کا مطالعہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ جو زندہ زبانیں ہیں ان کا مطالعہ توضیحی بنیادوں پر کیا جانے لگا۔ توضیحی سے مراد یہ ہے کہ وہ زبان ایک مخصوص دور میں کیسی ہے یعنی اس کی ہیئت کیسی ہے بجائے اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ زبان کب پیدا ہوئی اور مختلف زبانوں میں وہ کن کن تبدیلیوں سے گزری، بجائے اس کے ہم نے یہ دیکھنا شروع کیا کہ زبانوں کی ہیئت کیسی ہے یعنی جب زبانوں کی صوتی اور نحوی ساخت کو موضوع بنایا گیا تو توضیحی لسانیات وجود میں آئی۔

1933 میں Bloomfield کی کتاب "Language" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس میں Morphology, Phonology, Phonetics اور Syntax وغیرہ کی جامع تعریف بیان کی گئی ہے۔ تو گویا بیسویں صدی سے زبانوں کا جدید نقطۂ نظر سے مطالعہ شروع ہوا، اور نہ اس سے پہلے جو زبانوں کا مطالعہ تھا اس کو ہم علم السنہ یعنی Philology کہتے تھے۔ لسانیات کا نام بیسویں صدی کے آغاز سے دیا گیا۔ اردو میں لسانیات کے حوالے سے سب سے پہلا نام سید محی الدین قادری زور کا آتا ہے۔ انھوں نے دکنیات پر اپنے مطالعے کا اطلاق شروع کیا۔ انھوں نے دو کتابیں بہت اہم لکھی ہیں، ایک کتاب اردو میں ہے اور اس کا نام ہے "ہندوستانی لسانیات" جو 1932 میں شائع ہوئی لیکن اس سے پہلے ایک کتاب انگریزی میں "Hindustani Phonetics" کے نام سے تحریر کر چکے تھے جو 1930 میں پیرس سے شائع ہوئی۔ یہ دونوں ہی کتابیں لسانیات کی کتابیں ہیں جو اردو کے حوالے سے لکھی گئی ہیں اور ان میں بہت کچھ مواد موجود ہے۔ زور صاحب کے بعد پروفیسر مسعود حسین خاں نے یورپ اور امریکا میں جا کر لسانیات جدید کی تعلیم حاصل کی اور وہاں سے آنے کے بعد مضامین لکھے اور لسانیاتی نظریے کا اطلاق اردو پر کرنا شروع کیا۔ ان کی دو کتابیں مشہور ہیں۔ پہلی کتاب انگریزی میں "A Phonetics and Phenological Study of the Word in Urdu" ہے، اس کا اردو میں ترجمہ میں نے کیا ہے جس کا نام "اردو کا صوتیاتی اور صوتیاتی مطالعہ" ہے۔ ان کی دوسری کتاب "مقدمۂ تاریخ زبان اردو" ہے جس میں انھوں نے اردو زبان کے آغاز کا نظریہ پیش کیا ہے۔ بعد میں جن لوگوں نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے ان کی ایک لمبی فہرست ہے، میں نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

س: زبان اور انسانی سوچ کا تعلق چولی دامن کا ہے، موجودہ عہد میں ہماری زبان بھی دیگر زبانوں کی طرح کافی ترقی یافتہ زبان سمجھی جاتی ہے، کیا یہ زبان ہمارے اذہان کی مکمل ترجمانی کرنے میں صد فیصد کامیاب ہے یا اب بھی

اس میں اصلاح وترقی کی ضرورت ہے؟

ج: جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے یہ ایک مکمل اور ہر لحاظ سے ترقی یافتہ زبان ہے۔ ادبی اعتبار سے بھی یہ نہایت متمول زبان ہے۔ 1000 کے بعد سے ہندوستان میں اس زبان کا ارتقا شروع ہوا اور جیسے جیسے یہ زبان ترقی کرتی گئی اس کا ادبی فروغ بھی ہوتا گیا۔ آج یہ زبان نہ صرف یہ کہ ادبی مقاصد کے لیے استعمال کی جارہی ہے بلکہ اس زبان سے دوسرے سماجی و تہذیبی مقاصد بھی حاصل کیے جارہے ہیں، یعنی عدالتوں میں اس کا استعمال ہے، Mass, Media تعلیم گاہوں اور کھیل کے میدان میں اس کا استعمال ہورہا ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی مقاصد کے لیے بھی یہ زبان استعمال کی جارہی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ادبی مقاصد یعنی شعروشاعری کے علاوہ بھی زبان کے مختلف پہلو ہیں، اور ان تمام پہلوؤں کے لیے یہ زبان یعنی اردو زبان پوری طرح مکمل ہے اور اس میں کسی طرح کی اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔

س: کیا لسانیاتی مطالعہ نسلِ انسانی کے درمیان تفاوت پیدا کرتا ہے یا انھیں ایک دوسرے کے قریب آنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے؟

ج: بہت اچھا سوال ہے، دیکھیے، زبانیں ایک دوسرے کو جوڑتی ہیں اور جب زبانیں آپس میں جوڑنے کا کام کرتی ہیں تو اس سے دل جڑتے ہیں، تو یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ زبان تفاوت پیدا کرتی ہے۔ زبان تو آپس میں ملاتی ہے اور جب مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے کی زبان سیکھ جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں، ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ اگر ایک قوم ذہنی طور پر دوسری سے قریب آنا چاہتی ہے، ایک دوسرے کو جاننا چاہتی ہے تو یہ زبان کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔

س: صوتی تغیر ایک فطری عمل ہے جو زبان میں نامعلوم طریقے سے داخل ہوتا ہے۔ لفظوں کا تلفظ صوتی تغیرات پر ہی منحصر ہے۔ کیا صوتی تغیرات زبان کو مزید فصیح بناتے ہیں یا پھر، زبان کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں؟

ج: دیکھیے ہر زندہ زبان تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہے، اگر کسی زبان میں تبدیلی واقع نہ ہو تو وہ زبان جامد ہوجاتی ہے، اسی کو ہم مردہ زبان یا Dead Language کہتے ہیں۔ تغیر تو ہر زبان میں لازمی ہے بلکہ تغیر تو ہر چیز میں ہوتا ہے، یہی تغیر کا عمل ترقی کا ضامن ہے جس چیز میں تغیر ہوگا وہی ترقی پائے گی، جیسے انسان کی زندگی کو لیجیے بچہ پیدا ہوا، بڑا ہوا، جوان ہوا، پھر بوڑھا ہوا، تو یہ زندگی کے مختلف مرحلے ہیں اور یہ تغیر ہی کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ نباتات کو لیجیے، بیج بویئے، پودا نکلتا ہے، بڑا ہوتا ہے، پیڑ بنتا ہے پھر اس پر پھول اور پھل آتے ہیں، تو یہ بھی تغیر کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے جب زبانوں میں صوتی یا قواعدی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ زبان ترقی کررہی ہے۔ آج جو ہمارے پاس اردو زبان ہے وہ بھی ایک تغیر شدہ زبان ہے۔ اگر ہم 18ویں صدی یا 19ویں صدی کی زبان کو دیکھیں یا میر کی زبان کو دیکھیں تو میر کی زبان میں اور آج کی زبان میں بڑا فرق ہے۔ اگر آپ فضلی کی کتاب ''کربل کتھا'' کا مطالعہ کریں تو اس میں ایک جملہ ملتا ہے ''پھوپھیاں روتیاں تھیاں'' آج ہم کہیں گے کہ ''پھوپھیاں روتی تھیں'' یعنی اس زمانے میں امدادی افعال کی بھی جمع بنائی جاتی تھی۔ اسی طرح ''رسول کیاں باتاں'' اس زمانے میں جمع کا صیغہ آتا تھا تو ''کیاں'' کہتے تھے، تو زبان میں تغیر ضروری ہے، چاہے وہ صوتی تغیر ہو یا کسی بھی نوعیت کا تغیر ہو۔

س: کیا اردو اور ہندی ایک ہی زبان کی دو مختلف شکلیں ہیں جن کی پرورش و پرداخت ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب میں ہوئی؟

ج: یہ بہت ہی اہم سوال آپ نے کیا ہے۔ دیکھیے، اردو اور ہندی بول چال کی سطح پر ایک دوسرے سے بہت قریب آجاتی ہیں اور ایک زبان کا دوسری زبان پر دھوکا ہوتا ہے بلکہ ایک دوسرے میں مدغم ہوجاتی ہیں۔ لیکن علمی ادبی سطح پر یہ دونوں الگ الگ زبانیں ہیں۔ تمام ماہر لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ ہندی اور اردو، دو الگ الگ زبانیں ہیں اگرچہ ان کا ارتقا ایک ہی ماخذ سے ہوا ہے یعنی دونوں کھڑی بولی کی پیداوار ہیں، دونوں کی عام لفظیات ایک جیسی ہیں لیکن جب ہم اصطلاحات سازی کرتے ہیں تو ہمیں ہندی سے دور ہونا پڑتا ہے یا جب ہندی والے اصطلاح بناتے ہیں تو انھیں اردو سے دور ہونا پڑتا ہے۔ بول چال کی سطح پر دونوں زبانیں ایک دوسرے سے قریب اس وجہ سے آجاتی ہیں کہ دونوں پر پراکرت کا اثر زیادہ ہے لیکن پھر بھی دونوں زبانوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اردو میں پراکرت کے الفاظ کی تعداد زیادہ ہے اور ہندی میں پراکرت کے الفاظ کم ہیں۔ اسی طرح اردو میں عربی فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں جبکہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہے۔ مثلاً اردو میں ہم ''رات'' کہتے ہیں، علمی اور ادبی سطح پر بھی ہم ''رات'' کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب علمی، ادبی یا اعلیٰ سطح پر ہندی کا استعمال کیا جائے گا تو ''رات'' کی جگہ ''راتری'' کو ترجیح دی جائے گی اسی طرح ''آنکھ'' کا استعمال نہیں ہوگا ''نین'' کو ترجیح دی

جائے گی۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندی کا علمی اور ادبی جھکاؤ سنسکرت کی طرف ہے اور اردو کا علمی و ادبی جھکاؤ عربی فارسی کی طرف ہے۔ لیکن پراکرت کا بے پناہ ذخیرہ اردو نے اپنے اندر سمولیا ہے۔

شبلی نے اپنی کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' میں انیس کے ایک شعر سے فصاحت کی مثال دی ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

وہ کہتے ہیں کہ ''اوس'' کو اگر شبنم سے بدل دیجیے تو فصاحت غارت ہوجائے گی۔ تو یہاں ''اوس'' خالص پراکرت لفظ ہے جبکہ ''شبنم'' فارسی کا لفظ ہے۔ اوس کا لفظ ہندی والے بھی استعمال کرتے ہیں۔ تو یہی بنیادی وجہ ہے کہ اردو اور ہندی میں گہری مماثلتیں ہیں اور دونوں بول چال کی سطح پر تقریباً ایک جیسی ہوجاتی ہیں۔ لیکن اعلیٰ و ادبی سطح پر، اصطلاحات سازی کی سطح پر اور رسم خط کی سطح پر یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ ہندوستان کے دستور میں بھی ان دونوں زبانوں کی الگ الگ صراحت کی گئی ہے یعنی ہندوستان کے شیڈول (8) میں ہندی اور اردو کا الگ الگ ذکر ہے۔

س: بعض لوگ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اردو کو دیوناگری رسم خط کے ساتھ لکھنا چاہیے کیا یہ تجویز اردو کے لیے مناسب ہے؟

ج: اردو شمالی ہندوستان کی ایک نہایت ترقی یافتہ اور قدیم زبان ہے۔ قدیم ان معنوں میں کہہ رہا ہوں کہ تقریباً ایک ہزار سال سے یہ زبان قائم ہے۔ شمالی ہندوستان میں دوسری طاقتور زبان ہندی ہے اور اس کا رسم خط دیوناگری ہے، ابھی جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ بول چال کی سطح پر ہندی اور اردو دونوں ایک ہیں، اگر اردو کا رسم خط بدل کر دیوناگری کردیا جائے تو پھر ہندی اور اردو میں فرق کرنا مشکل ہوجائے گا۔ اردو، اپنے رسم خط سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ اردو کو اگر ناگری رسم خط کا جامہ پہنایا گیا تو اردو اور ہندی دونوں مدغم ہوجائیں گی۔ ہندی چونکہ ہندوستان کی اکثریتی زبان ہے اور اردو اقلیتی زبان ہے، اگر اردو کا رسم خط بدل دیا جائے گا تو یہ زبان بالکل معدوم ہوجائے گی، اس کا وجود ناپید ہوجائے گا۔ لہٰذا اپنی حیثیت اور اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے اردو کو اپنے رسم خط کے ساتھ ہی جینا ہوگا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہم اس کا رسم خط اس لیے بھی نہیں بدل سکتے کہ اردو نہ صرف ہندوستان میں بولی جاتی ہے بلکہ ہندوستان کے باہر یعنی عرب ممالک اور یورپ اور امریکا میں بھی بولی اور لکھی جاتی ہے اور وہاں بھی اردو اپنے اسی رسم خط کے ساتھ پہچانی جاتی ہے۔ تو فرض کرلیجیے کہ اگر آپ ہندوستان میں اس کا رسم خط بدل دیں تو اس سے کیا فائدہ ہوگا، دوسری جگہ کے لوگ تو نہیں بدلیں گے، دوسری جگہ تو اردو اسی رسم خط کے ساتھ پہچانی جائے گی جو اس کا موجودہ رسم خط ہے تو یہ دورنگی اچھی نہیں ہوگی۔ لہٰذا اردو کی بقا کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اردو اپنے موجودہ رسم خط کے ساتھ قائم رہے۔

س: اردو زبان کو اردو کے نام سے کب موسوم کیا گیا یعنی اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ اس زبان کو کبھی ہندی کبھی ہندوی اور کبھی ریختہ کہا گیا؟

ج: زبان جب پیدا ہوتی ہے تو فوراً اس کا نام نہیں رکھا جاتا۔ زبان پہلے پیدا ہوتی ہے پھر عوام میں اس کا استعمال ہوتا ہے یعنی ادائے مطلب کے لیے وہ استعمال کی جاتی ہے اور پھر بہت بعد میں اس کا کوئی نام رکھا جاتا ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ پورے شمالی ہندوستان میں سنسکرت زبان ایک ہزار سال تک قائم رہی یعنی 1500 ق.م. سے لے کر 500 ق.م. تک یہ زبان پھلتی پھولتی رہی لیکن اس کا نام سنسکرت نہیں پڑا، اس کا نام سنسکرت تو بعد میں رکھا گیا۔ سنسکرت زبان کا سب سے بڑا قواعد نویس ''پاننی'' جس نے پوری سنسکرت زبان کو قواعد کے اصولوں میں جکڑ دیا ہے اور اس کی کتاب ''اشٹادھیائے'' کو یورپ اور امریکا نے تسلیم کیا ہے یہ سنسکرت زبان کے قواعد کی ایک مستند کتاب ہے، اس نے اپنی زبان کو کہیں سنسکرت نہیں کہا ہے اس نے اپنی زبان کو ''بھاشا'' کہا ہے۔ اس زبان کا سنسکرت نام تو بہت بعد میں پڑتا ہے۔ اسی طرح گوتم بدھ کی زبان کا نام ''پالی'' بہت بعد میں پڑا، اگرچہ یہ زبان بہت پہلے وجود میں آچکی تھی۔ اسی زبان میں گوتم بدھ نے اپنی مذہبی تعلیمات کی تبلیغ کی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ زبانیں پہلے بن جاتی ہیں نام ان کا بعد میں پڑتا ہے۔ اسی طرح اردو جن حالات میں پیدا ہوئی یعنی کھڑی بولی سے جو زبان پیدا ہوئی اس کا نام پہلے ہندی اور ہندوی رکھا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان سے نسبت رکھنے والی۔ شروع شروع میں جب مسلمان شمالی ہندوستان میں آئے اور 11ویں اور 12ویں صدی میں انھوں نے اپنی سلطنت قائم کی تب انھوں نے دہلی اور نواح دہلی میں بولی جانے والی زبان کو ہندی کہہ کر پکارا۔ ہندی سے مراد ہے ''ہند'' سے نسبت رکھنے والی اور ''ہند'' کا لفظ ''سندھ'' سے بنا ہے سندھ میں ''س'' کو ''ہ'' سے بدل دیا گیا یعنی جہاں جہاں سنسکرت میں

''س'' کی آواز تھی وہاں وہاں ایرانیوں نے ''ہ'' رکھ دیا مثلاً سنسکرت میں ایک لفظ ہے ''سپت'' اس کے معنی ہیں سات، تو ''س'' کو ''ہ'' سے بدل دیا، اس طرح وہ ''ہفت'' ہوگیا، اس سے ''ہفتہ'' بن گیا۔ اس طرح سندھ اور شمالی ہندوستان کے میدانی علاقے کو انھوں نے ''ہند'' کہا اور یہاں کی زبان کو ''ہندی'' کہنا شروع کیا اور یہاں کی قوم کو ''ہندو'' کہا۔ تو یہ لفظ 'ہندی' اور 'ہندو' دونوں نہ تو سنسکرت لفظ ہیں نہ پراکرت لفظ ہیں اور نا ہی اپ بھرنش کے ہیں، یہ خالص ایرانی لفظ ہیں۔ اسی طرح سے نووارد مسلمانوں نے ''ہندوی'' بھی کہنا شروع کیا۔ سب سے پہلا استعمال تو مسعود سعد سلمان کے سلسلے میں ملتا ہے کہ وہ ''ہندوی'' کے شاعر تھے، اور امیر خسرو نے اپنی مثنوی ''غرۃ الکمال'' میں ہندوی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد عوفی نے 1228 میں ایک تذکرہ ''لباب الالباب'' کے نام سے لکھا، اس میں ہندوی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تو اس زبان کو شروع میں ہندی اور ہندوی کہا گیا پھر جب اس میں شعری کاوشیں شروع ہوئیں تو اس کا نام ریختہ پڑا، یہ بھی فارسی کا لفظ ہے، پھر عرصۂ دراز کے بعد اس کا نام ''زبان اردوئے معلائے شاہ جہان آباد'' رکھا گیا بعد میں ''شاہ جہان آباد'' کا لفظ ہٹ گیا تو یہ ''زبان اردوئے معلی'' ہوئی، پھر ''معلی'' ہٹ گیا تو یہ ''زبان اردو'' ہوئی، پھر زبان کا لفظ بھی ہٹ گیا تو یہ ''اردو'' ہوئی۔ مفرد لفظ ''اردو'' اسم لسان کے معنی میں سب سے پہلے غلام ہمدانی مصحفی نے استعمال کیا ہے اور مصحفی کا یہ شعر ہے کہ:

خدا رکھے، زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

یہ سب سے پہلا استعمال ہے جو مصحفی نے کیا ہے اور شمس الرحمن فاروقی صاحب نے اس پر بہت تحقیق کی ہے کہ یہ نام کیسے پڑا اور اپنی کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' میں اس پر پورا ایک باب صرف کیا ہے۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ سب سے پہلے اسم لسان کے معنی میں ''اردو'' کا استعمال مصحفی کے یہاں ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ شعر غالباً 1772 یا 73 کا ہے یعنی 18ویں صدی کے آخری ربع کا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کا نام ''اردو'' 18ویں صدی کے اواخر میں پڑا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے پہلے یہ زبان نہیں تھی، زبان اس سے کئی سو سال پہلے بن چکی تھی لیکن یہ دوسرے ناموں سے پکاری جاتی تھی۔ مثلاً ہندی، ہندوی اور ریختہ کے علاوہ یہ زبان، زبان دہلی، گجری، دکھنی اور زبان ہندوستان کے نام سے بھی جانی جاتی تھی۔

س: وہ کون کون سی آوازیں ہیں جو خصوصاً اردو کی اپنی ہیں اور یہی آوازیں اردو کے تشخص کی ضامن ہیں؟

ج: اردو کی شناخت اس کی مخصوص آوازوں سے ہے جو ہندوستان کی دوسری زبانوں میں نہیں ہیں یا شاید شاذ و نادر ہیں، وہ آوازیں، خ، غ، ق، ز، ژ اور ف ہیں۔ یہ چھ آوازیں ایسی ہیں جو ہند آریائی زبانوں میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ یہ آوازیں عربی، فارسی ماخذ سے آئی ہیں اور انھی کی وجہ سے اردو کی شناخت قائم ہے۔

س: دنیا کی تمام زبانوں میں مصوتوں کی تعداد کم و بیش یکساں ہے، یہ بتائیں کہ اردو میں مصوتوں کی کل تعداد کتنی ہے؟

ج: اردو میں مصوتوں کی تعداد، دس ہے اور اس میں دو دوہرے مصوتے بھی شامل ہیں جنھیں انگریزی میں "Diphthong" کہتے ہیں یعنی ''آئی'' اور ''آؤ'' کی آوازیں دوہرے مصوتوں کی مثال ہیں۔ مثلاً ''کوا'' اس میں ''ک'' کے بعد جو مصوتہ ہے وہ دوہرا مصوتہ، یعنی Diphthong ہے اسی طرح ایک لفظ ''عیار'' ہے اس میں پہلی آواز دوہرا مصوتہ ہے، ''عیاش'' میں بھی پہلی آواز دوہرے مصوتے کی پہچان ہے۔ تو اردو میں آٹھ تو سادے مصوتے ہیں اور دو دوہرے ہیں، مصوتوں کی کل تعداد دس ہے۔

س: نئی نسل کے نام کوئی پیغام؟

ج: نئی نسل کے نام میرا یہی پیغام ہے کہ ان کو اپنی زبان سے محبت کرنی چاہیے، اس کو سیکھنا چاہیے اور دوسروں کو سکھانا چاہیے۔ زبان کا تہذیب کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔ جب انسان کی زبان ترقی کرتی ہے تو اس کا مطلب ہے اس کی تہذیب ترقی کر رہی ہے اور انسان اپنی تہذیب سے کٹ کر الگ نہیں رہ سکتا۔ زبان اپنی شخصیت کی نمائندہ ہوتی ہے لہٰذا زبان کو اچھی طرح سیکھنا چاہیے، اس کے تلفظ پر قابو پانا چاہیے، اس کے رسم خط کو سیکھنا چاہیے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔

□□□

پتہ:
Room No. 50, Ameen Hostel,
M.M. Hall, A.M.U., Aligarh
Pin - 202002 (U.P.)

خواجہ غلام السیدین (ہماری مطبوعات سے)

گاؤں میں تعلیم کا رول

ہم اس موقع پر ابتدا ایک فرسودہ قول سے کرتے ہیں۔ اکثر فرسودہ اقوال میں صداقت کا مغز موجود ہوتا ہے اور اگر ہم انھیں یکسر فرسودہ سمجھ کر ٹال نہ جائیں تو یہ خاصے مفید بھی ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان اصلاً دیہاتوں کی سرزمین ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں سات لاکھ گاؤں تھے اور اگر ہم مجموعی طور پر ملک کی بھلائی کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو آغاز کار کے لیے موزوں جگہ اور مرکز توجہ گاؤں ہی کو ہونا چاہیے۔ موجودہ صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اکثر تعلیمی اور سماجی تحریکیں شہروں اور شہری علاقوں ہی میں ابھریں اور جہاں تک حکومت یا کارکنانِ قوم کا تعلق ہے، گاؤں کے وجود کا انھیں محض سطحی شعور تھا۔ لہٰذا دیہات کی بہتری کے لیے کچھ زیادہ نہیں کیا جاسکا۔ یہ صورت حال کچھ تو اس بنا پر تھی کہ ہندوستانی طرز زندگی میں گاؤں کی اہمیت کا پورا پورا احساس نہ تھا اور کچھ اس بنا پر کہ مسئلہ اتنا زبردست تھا کہ لوگ سمجھتے تھے اس معاملے میں کچھ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ مشکل اور ناگوار فرائض سے بچنے کے لیے انسان کی ذہانت نہایت خوشنما بہانے تراش سکتی ہے۔ لیکن کچھ مستثنیات بھی تھے۔ متفرق افراد اور کچھ مختصر گروہ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے آپ کو پورے اخلاص کے ساتھ گاؤں کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا اور حکومت کی طرف سے بھی کبھی گاؤں کی تعمیر و ترقی کے کام میں ہماہمی نظر آجاتی تھی۔ لیکن ان کی حقیقت اس سے زیادہ نہ تھی کہ گویا یہ تاریک افق میں کہیں کہیں جھلملاتی ہوئی کمزور روشنی کے نقطے ہوں۔ یہ دعویٰ بالکل بجا ہوگا کہ جب تک گاندھی جی نے منظرِ عام پر آکر تقریباً سبھی سماجی، سیاسی اور اقتصادی قدموں اور اصولوں کو یکسر الٹ کر نہ رکھ دیا، اس وقت تک گاؤں اپنے صحیح مقام کو نہ پاسکا تھا، اور نہ ہی ہمارے سیاستدانوں کی توجہات کا مرکز بن سکا تھا۔ گاندھی جی ہی کی ذات تھی جس نے خیال و مثال کے ذریعے ہندوستانی رہنماؤں کو یہ بنیادی، حقیقت سمجھائی کہ انھیں رخ گاؤں کی طرف پھیر دینا چاہیے اور تعمیرِ نو کی ابتدا اسی نقطے سے کرنی چاہیے۔ اگر وہ فی الواقع ملک کی صورتِ حال کو بنیادی طور بدل دینے کے خواہشمند ہیں۔ یہ انھی کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ ہزاروں رضاکاروں نے دیہی آبادی میں اپنے آپ کو گم کر دیا۔ کام ان کا نہایت صبر آزما تھا اور بہت کم ایسا ہوا کہ وہ منظرِ عام پر آسکا ہو، لیکن بتدریج سیاسی بیداری اسی کی بدولت پیدا ہوئی، جو بالآخر حصول آزادی کی مہم سر کر کے رہی۔

اس ذکر سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس خاموش لیکن کثیر الاطراف انقلاب کی تاریخ بیان کروں جو ہمارے دیہی علاقوں میں رونما ہوا اور جو اگرچہ ابھی تک مکمل نہیں ہوسکا ہے، لیکن قومی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ضرور کرتا ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ بہتر، خوشحال اور بامراد گاؤں کی تعمیر جدید میں تعلیم کے رول کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کردوں۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ابتدائی تعلیم کو بہتر بنانے کی کوشش کہیں کہیں جاری تھی، لیکن واضح رہنمائی اس میدان میں بھی گاندھی جی ہی سے ملی۔ جب کہ انھوں نے 1937 میں اپنے بنیادی اصول کی اسکیم کو عملی صورت بخشی۔ زندگی بھر کے تجربات نے انھیں یقین دلایا تھا کہ کسی سماجی، سیاسی اور اقتصادی تبدیلی کا رونما ہونا ممکن نہیں، جب تک کہ تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلی نہ پیدا کردی جائے اور یہ تبدیلی محض طریق تدریس یا نصاب تعلیم ہی میں نہ ہو بلکہ تعلیم کے فکری نظام اور اس کے مقاصد تک کو متاثر کرے۔ اس طرح انھوں نے ملک اور ماہرینِ تعلیم کے سامنے اپنی بنیادی تعلیم کی اسکیم رکھی، جس کا مرکزی تصور یہ ہے کہ تعلیم کا مطمحِ نظر کتابیں نہیں بلکہ گاؤں کے وہ پیشے اور مشاغل ہونے چاہئیں، جو دیہی زندگی کی روحِ رواں ہیں۔ موجودہ نظام جو لکھنے پڑھنے اور حساب کی جامد تدریس تک محدود ہے، نہ صرف خود زندگی سے بے تعلق ہے،

"تعلیمی تشکیل نو کے مسائل" سے ماخوذ، مصنف: خواجہ غلام السیدین / صفحات۔ 307، قیمت: -/96 روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

بلکہ اسکول کے بچوں کو بھی زندگی کے حرکت آفریں اور بامعنی مشاغل سے کاٹ کر الگ کردیتا ہے۔ دیہات کا کوئی اسکول اگر بچوں کو خود دیہی زندگی سے اجنبی بنادیتا ہے، تو پھر ایسے اسکول کو دیہات کے لوگ اپنے دل و دماغ میں کیسے جگہ دے سکتے ہیں؟ اور یہ بچے دیہاتی زندگی میں کس طرح کسی قابل قدر یا تخلیقی کارنامے کا اضافہ کرسکتے ہیں؟ فطری طور پر ان بچوں کا ماحول یہی ہوگا کہ گاؤں سے تو کٹ کر الگ ہوجائیں اور قریبی شہروں میں اپنے لیے کوئی راستہ نکالیں۔ اس طرح حوصلہ مند اور باصلاحیت بچے گاؤں سے دور تر ہوجاتے ہیں اور گاؤں کا مستقبل مفلس سے مفلس تر ہوتا جاتا ہے۔ دیہی تعلیم کی ذمے داری ایک ایسی فکری بنیاد فراہم کرنا اور اسے عملی شکل دینا اور ایسی تدابیر اختیار کرنا ہے جو بچوں کے اندر گاؤں میں مستقل قیام کی خواہش کو مستحکم کرے اور ان کو اس طرح تربیت دے کہ وہ ان بستیوں کی خدمت اور خوشحالی اور ترقی کے کاموں میں لگ جائیں۔ صرف یہی چیز ہے جو تعلیم کو حقیقت سے ہمکنار کرسکتی ہے اور بچوں کی دلچسپی کو بروئے کار لاسکتی ہے، وہی دلچسپی جسے کتابی نصاب تعلیم اور غیر نفسیاتی طریق تعلیم نے یکسر نظرانداز کردیا ہے۔

گاؤں کی تشکیل جدید میں تعلیم کے رول کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے: گاؤں کے وہ کون سے مخصوص مسائل ہیں جن سے دانشمندانہ اور بامقصد طور پر نمٹنے کے لیے بچوں کو تیار کرنا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ گاؤں اصل میں ایک ایسی برادری ہے جہاں سب کام کرتے ہیں کہ جہاں صحت مند سماجی حالات میں سبھی کو کام کرنا ہے اور یہ کام کتابوں اور فائلوں کا کام نہیں ہے یہاں تو آدمی ہے، کچھ اشیا اور اوزار ہیں اور فطرت کا کھلا میدان ہے اور کام جو کچھ ہے سرتاسر عملی، پیداواری ہے، جسمانی مشقت کا ہے۔ مثلاً زمین جوتنا ہے، فصل اگانا، مویشیوں کی دیکھ بھال کرنا، اینٹیں تھاپنا، کپڑا بننا، جھونپڑیاں بنانا اور ان مختلف ضرورتوں میں ایک دوسرے کی عملاً مدد کرنا، جو گاؤں کی زندگی کو رواں دواں رکھتی ہے۔ اب اگر اس نقشے میں کسی بچے کو اپنے لیے جگہ بنانا ہے، تو کوئی بھی عملی کام اس کے سامنے آئے اسے خوش دلی اور مہارت کے ساتھ انجام دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مدرسہ کی تعلیم کا مرکز، دستکاری اور عملی کام کو ہونا چاہیے اور جیسا کہ میں نے کسی اور جگہ وضاحت کی ہے کہ یہی وہ تعلیمی طریقہ کار ہے، جسے بنیادی تعلیم میں اختیار کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں گاؤں کے اور مسائل بھی ہیں مثلاً صفائی، آب رسانی، اور حفظان صحت، مجبوری کی فرصت، نقصان رساں کام کے طریقے۔ یہ سب اسی وقت حل ہوسکتے ہیں جب گاؤں کے رہنے والے لوگ ان کے بارے میں مناسب اور صحیح علم رکھتے ہوں اور انھیں اسی علم کو زندگی میں پیش آنے والے مختلف حالات میں استعمال کرنے کی تربیت بھی حاصل ہو۔ ہمیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ ایک ایسا نصاب تعلیم ترتیب دیا جائے اور خاص کر سماجی علوم اور جنرل سائنس میں، جو دیہی زندگی کے حقیقی مسائل سے پوری طرح مربوط ہو اور جسے اس طرح پیش کیا جائے کہ مدرسہ کی تعلیم اور زندگی میں پیش آنے والے مسائل کے بیچ کی روایتی دیوار آپ سے آپ غائب ہوجائے۔

پھر اس کی بھی ضرورت ہوگی کہ اعلیٰ سطح پر دیہی ادارے قائم کیے جائیں جہاں نوجوان مردوں اور عورتوں کو گاؤں کی تشکیل جدید کے سلسلے کے سماجی اور تکنیکی مسائل کو ماہرانہ طور پر حل کرنے کی تربیت دی جائے۔ مرکزی حکومت نے رورل انسٹی ٹیوٹ کی اسکیم کی ابھی ابھی ابتدا کی ہے، تو اسے اسی ضرورت کا جزوی حل سمجھنا چاہیے۔ سوم یہ کہ بہت سے تعصبات، توہمات اور غیر صحت مند اور شہریت کے اصول کے خلاف سماجی رسم و رواج ہیں جو ہمارے دیہاتوں میں روشن خیالی اور صحیح طرز زندگی کی راہیں روکتے ہیں۔ مدرسے کو اس لائق ہونا چاہیے کہ نہ صرف بچوں بلکہ ان کے والدین میں بھی اس طرح کے خیالات و اعمال کی نامعقولیت اور خطرات کا احساس پیدا کردے اور ظلمت پسندی اور غلط روایات کے خلاف برسرپیکار ہو۔

یہ سارا کام مطالبہ کرتا ہے کہ مدرسہ کے تمام بچوں میں سماجی خدمت کا جذبہ ہونا چاہیے تاکہ وہ محض آپ ہی اچھی باتیں سیکھنے اور عمدہ طور طریقے اختیار کرنے پر اکتفا نہ کریں بلکہ اپنے حلقے کے بھی لوگوں کو اپنے علم و عمل میں شریک کرنے کے لیے بےچین ہوں۔ مدرسے کو اس طرح ہمیں ایک ایسی زندگی اور ایک ایسے رواں دواں ماحول میں پروان چڑھانا ہے، جہاں بچوں کو نہ صرف ایک مستقبل بعید کے لیے سماجی خدمات کی تربیت دی جاتی ہے بلکہ ان کی صلاحیت اور سکت کے مطابق مختلف قسم کی سماجی خدمات کے حقیقی مواقع فی الحال موجود ہوتے ہیں۔ کوئی یہ نہ سوچے کہ بچے آخر کر ہی کیا سکتے ہیں! جہاں دل کی لگن ہو اور معلمین میں تخیل اور عقل سلیم موجود ہو، وہاں بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ کچھ ہی سال پہلے کی بات ہے، میں نے ریاست ممبئی کے اسکولوں میں رضاکارانہ اصول پر کی جانے والی سماجی خدمات کا سروے کرایا تھا۔ مجھے یہ معلوم کرکے مسرت بخش تعجب ہوا کہ ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کے بچے اس نئے تعلیمی نصب العین کی پکار کا کس خوبی سے استقبال کررہے ہیں اور وقت کے چیلنج کا کتنا مقابلہ کررہے ہیں۔ وہ زیادہ اناج اگاؤ کی مہم چلا رہے تھے، گاؤں کی صفائی کا انتظام کرتے تھے، سماجی تعلیم کے مراکز چلا رہے تھے، مقامی

آبادیوں پر تفریحی مشاغل کا بندوبست کرتے تھے، اسپتالوں کا معائنہ کرتے تھے اور ان کے علاوہ مختلف مفید سماجی خدمات میں لگے ہوئے تھے۔ یقیناً سبھی اسکول ایسا نہیں کر رہے ہیں، کرنے والے تو مجموعی تعداد کا ایک حقیر سا حصہ ہیں لیکن مستقبل کے حق میں وہ ایک شگون نیک ہیں اور وہ اس حقیقت کا پتہ دیتے ہیں کہ اگر سچی لگن اور صحیح علم ہو، تو دوسرے اسکول بھی کیا کچھ کر سکتے ہیں، اور یہ کام ہر منزل اور ہر مقام سے شروع کیا جاسکتا ہے، وہ بیج جو جڑ پکڑنے کے بعد قابلِ قدر سماجی خدمات کے برگ و بار لاسکتے ہیں وہ بچوں کے دماغوں میں پرائمری منزل سے بھی پہلے جمائے جاسکتے ہیں۔ ہم اپنے بیسک اسکول میں ننھے بچوں کو بھی اجتماعی ڈھنگ سے کام کرنے پر اکساتے ہیں۔ انھیں چھوٹے چھوٹے فرائض، اور ذمے داریوں کو قبول کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں مثلاً اپنے کمروں کو صاف ستھرا رکھنا اور جس قدر ممکن ہو اپنے اسکول کی دیکھ بھال کرتے رہنا وغیرہ۔ کچھ ہی مدت کے بعد اسکول کے باہر کام کرنے اور دیہات کے لوگوں کے دوش بدوش ان کے مشاغل اور مصروفیتوں میں شریک ہونے، نیز صفائی اور صحت کے پروگرام چلانے کے لیے ان کے حوصلے بڑھائے جاتے ہیں۔ اگر یہی جذبہ ابتدائی تعلیم کے بعد بھی باقی رکھا جاسکے اور ثانوی اسکول اور کالج کے طلبہ اور اساتذہ میں بھی یہی لگن اور اسپرٹ ابھاری جاسکے، تو ہم اپنی دیہی آبادیوں میں ایک خاموش مگر عظیم انقلاب لاسکتے ہیں۔ یہ بڑی عمر کے طلبہ اپنی چھٹیوں اور بڑی تعطیلات کو گاؤں میں کام کرنے کے لیے وقف کر سکتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی تکنیکی معلومات اور تہذیبی ورثے کی مدد سے گاؤں کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لیبر اینڈ سوشل سروس کیمپس اور طلبہ کے ذریعے چلائے جانے والے درسگاہی منصوبوں کی تحریک نے جس کی ابتدا اول پنج سالہ منصوبے کے دوران ہوئی تھی اور جسے برابر جاری رکھا گیا ہے، اسکولوں اور کالجوں میں اچھی خاصی دلچسپی اور جوش و خروش کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ لیکن اس سلسلے کا بیشتر کام، گاؤں کے ہزاروں گمنام ابتدائی اور ثانوی اسکولوں ہی کو کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ کوئی بھی جماعت اپنے مستقبل کو اپنے ہی افراد کے ذریعے ذاتی سوجھ بوجھ سے کام لے کر اور اپنی مدد آپ کر کے ہی روشن بنا سکتی ہے۔ اگر شہروں کے تعلیم یافتہ نوجوان گاؤں میں جاتے ہیں تو اس سے خود انھی کی روحوں کو بالیدگی نصیب ہوگی کہ وہ اس قرضے کا کسی حد تک بھگتان کر سکیں گے، جو دیہاتوں کا شہروں کے ذمے چلا آتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اور بہت سی باتیں سیکھ سکیں گے۔ مگر ہماری دیہی آبادی کی تعمیر تو اسی وقت ممکن ہوگی جب ان میں رہنے بسنے والے بچے خود اعتمادی کا سبق سیکھ لیں گے اور سماجی شعور و احساس سے معمور ہو کر ان تمام رکاوٹوں کو دور کر دینے کا تہیہ کر لیں گے، جو ایک بہتر زندگی کی راہ ہموار کرنے میں مانع ہیں۔

اب یہ صاف عیاں ہے کہ یہ کام ہے ایک جاندار اور از سر نو منظم کیے گئے نظامِ تعلیم کا جس کی جڑیں دیہی زندگی کی گہرائیوں میں جمی ہوئی ہوں اور جو ساتھ ساتھ ایسے نصب العین سے فیضان حاصل کرلے جسے آسمان کے ستاروں سے بھی آنکھیں ملانے میں باک نہ ہو۔

انڈین یونیورسٹیز کمیشن کی قابلِ قدر رپورٹ میں ایک نہایت قیمتی باب دیہی یونیورسٹیز پر بھی ہے اور اصل بحث کی تمہید کے طور پر اس میں بنیادی اور مابعد بنیادی تعلیم کے امکانات کا جائزہ گاؤں کی صورتِ حال کے پیش منظر میں لیا گیا ہے۔ میں یہاں اس کا ایک اقتباس پیش کروں گا کیوں کہ یہ دیہی تعلیم کے باب میں میرے نقطۂ نظر کی مستند حمایت پیش کرتا ہے۔

''اپنی تاریخ کے اس فیصلے کن مرحلے پر ہمارے سامنے فلسفہ، تعلیم اور ساتھ ساتھ ایک عملی نقشے کا پیش کیا جانا جو عالمگیر اساسی خوبیوں کا حامل ہے اور جس کے ذریعے سے ٹھیک ہماری آرزوؤں کے مطابق ایک جدید ہندوستان کی تخلیق میں بھرپور مدد مل سکتی ہے ہم سب کے لیے انتہائی خوش قسمتی کا باعث ہے۔ گاندھی جی کے تصورِ تعلیم کو مجموعی طور پر اپناتے ہوئے ایک ایسے طریقۂ تعلیم کی تخم پاشی کرنا ہے جو انسانی شخصیت کی تکمیل اور پاکیزگی کا ضامن ہوگا اور جیسے جیسے وقت گزرے گا اس کی حکمت اور عمدگی نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جائے گی اور وہ وقت کی ہر آزمائش اور وقت کی کسوٹی پر کھرا اترے گا۔ تعلیم کے حق میں دنیا کے جو عظیم عطیات ہیں یہ تصور فطری طور پر ان میں سے ایک ہے۔''

اس طریقے کی مبادیات کا جو خاکہ گاندھی جی نے پیش کیا ہے وہ چھوٹے بچوں کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل کا محض ایک ذریعہ ہی نہیں ہے بلکہ انھوں نے تعلیم کے ایک عالمگیر طریقے کی ضروری عناصر کی وضاحت کی ہے جس کا تعلق اس دور سے لے کر جب بچہ ماں کے کاموں میں شرکت کرنے کے قابل ہوجاتا ہے اس وقت تک ہے جب وہ اپنی شخصیت کی بتدریج تکمیل کے ساتھ اس دور میں داخل ہوتا ہے جب ایک پختہ کار انسان کی حیثیت سے اپنے مرتب و منضبط فکر و کردار کی مدد سے ایک عظیم تخیل کو عملی صورت بخشنے کے لیے کسی ماہرِ فن کے پہلو بہ پہلو کام کرنے لگتا ہے۔

جب تعلیم کا یہ عظیم نقشہ عملاً بروئے کار آئے گا، اسی وقت یہ ممکن ہوگا کہ ہمارے تخیل کے بہتر دیہات وجود میں آئیں۔

□□□

گیان چند جین

(ہماری مطبوعات سے)

محقق کے اوصاف

کامیاب تحقیق کار میں کئی اوصاف اور صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے، وہ نیا ریسرچ اسکالر ہو یا پرانا محقق۔ ذیل میں انھیں چند زمروں کے تحت درج کیا جاتا ہے: کرداری، ذہنی، ادبی، علمی۔

الف۔ کرداری یا اخلاقی: قاضی عبدالودود کا قول ہے ''کسی ملک کے باشندے کا معیار اخلاق پست ہو اور وہ کام سے جی چراتے ہوں تو وہاں بالعموم تحقیق کا معیار پست ہوگا'' (1)

تحقیق کار کے کردار میں حسب ذیل اوصاف ضروری ہیں:

1. حق گوئی: تحقیق محض ایک ادبی مشغلہ ہی نہیں، یہ ایک مسلک، ایک ذہنی رویہ، ایک طرز زندگی ہے، یہ سچ کا کاروبار ہے۔ محقق کو تحریر میں، نیز روزانہ زندگی میں، سچ کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔ فریب، ریا، تصنع، خفیف الحرکاتیاں تحقیقی مزاج کے منافی ہیں۔ مثلاً کسی دوسرے کی دریافت کو بغیر حوالے کے اپنا لینا، بالفاظ دیگر سرقہ کر لینا ایک غیر محققانہ کردار کا غماز ہے۔

2. بے تعصبی اور غیر جانب داری: اپنے مذہب، قوم، زبان، علاقے، فرقے، ادبی گروہ کسی کے لیے جانب داری نہیں ہونی چاہیے۔ اگر کوئی ہندو یہ تحقیق کر رہا ہے کہ چھنو لال دلگیر مسلمان ہوا تھا کہ نہیں، اور ایسے دلائل ملتے ہیں جس سے اس کا مسلمان ہونا ثابت ہو تو وہ ان دلائل کو ضرور افشا کرے۔ شیعہ ہے تو اس پر لازم نہیں کہ ہر شیعہ ادیب کی وکالت کرے، یوپی و پنجاب، شمال و دکن، شیخ و سید، قادیانی، مہدوی، جولاہا، کشمیری، پنڈت، کایستھ ہر قسم کے گروہی امتیازات محقق کے لیے بے معنی ہیں۔ تحقیق غیر جذباتی ہوتی ہے۔

اسے اپنے گروہ کے علاوہ اپنے پسندیدہ اور ناپسندیدہ ادیبوں کے سلسلے میں بھی غیر جانب داری سے کام لینا چاہیے۔ اگر کوئی میر، انیس، اقبال، سرسید یا پریم چند وغیرہ میں کسی کا گرویدہ ہو لیکن دوران تحقیق ان کے خلاف کچھ معلوم ہو تو اسے ہرگز نہ دبائے۔ اسی طرح اپنے استاد، شاگرد یا عزیز کی جنبہ داری اور عیب پوشی نہ کرے۔

3. ہٹ دھرم اور ضدی نہ ہو: تحقیق کی ابتدا میں جو مفروضہ قائم کیا ہے، بعد میں اس کے خلاف دلائل ملیں تو اپنا موقف بدلنے میں ہچکچاہٹ نہ ہو۔ مثلاً میرا موقف ہے کہ:

غزالاں تم تو واقف ہو..... والا شعر رام نراین موزوں کا ہے، کوئی دوسرا عالم اسے موزوں کا نہیں مانتا تو میں اس کے دلائل پڑھوں، مزید مطالعہ کروں اور اگر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ شعر موزوں کا نہیں ہے تو اسے ماننے میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔ تحقیق اور مناظرے میں بھی فرق ہے۔ تحقیق میں مواد اور دلائل کا مطالعہ کر کے کوئی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے اور اس کی تائید میں دلیلیں تلاش کی جاتی ہیں۔

4. کسی دنیوی فائدے کی تلاش نہ کرے: دولت، انعام، ترقی عہدہ، جاہ وغیرہ تحقیق کے مقصود نہ ہوں۔ تحقیق برائے علم ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر بے روزگاری کا حل نکل آئے گا۔ ڈی لٹ کر لی جائے تو دوسرے رفقا کے مقابلے میں بڑھ کر ریڈر یا پروفیسر بننے کے امکانات بہتر ہو جائیں گے۔ کسی ادیب پر کتاب لکھ دی جائے یا کسی کا دیوان مرتب کر لیا جائے تو اس پر کسی اکادمی سے دو تین ہزار کا انعام مل جائے گا۔ ساہتیہ اکادمی کا انعام لینے کے لیے ڈٹ کر ایک ضخیم کتاب لکھی جائے تو شاید وہ مقصود دامن میں آجائے۔ یہ سب خواہش فطری ہیں لیکن ان کے سائے میں کی ہوئی تحقیق اتنی بے لوث اور منزہ نہیں ہوگی جتنی بے غرض تحقیق۔ اس موضوع پر رشید حسن خاں نے اپنے مضمون ''تحقیق اور بوالہوسی'' میں بڑے مزے سے لکھا ہے۔ (2)

5. تحقیق کی طرف رغبت اور ولولہ ہو۔

6. مزاج میں ڈٹ کر محنت کرنے کا مادہ ہو: یہ تحقیق میں سچی لگن ہی سے میسر آسکتا ہے، تھوڑے سے نتیجے کے لیے بہت سے مآخذ دیکھنے پڑتے ہیں۔ عبدالرزاق قریشی نے محققوں کی جفاکشی کی دو مثالیں نقل کی ہیں:

'' کیونڈش کی محنت و انہماک کی یہ حالت تھی کہ اس کا دوپہر کا کھانا ایک

''تحقیق کا فن'' سے ماخوذ، مصنف: گیان چند جین / صفحات: 650، قیمت: -/170 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

سوراخ کے ذریعے سے اس کے کمرے میں رکھ دیا جاتا تھا کہ اس کے کام میں خلل نہ پڑے۔'' (3)

میں اس حد تک انہماک کی سفارش نہیں کرتا۔ یہ تحقیقی رہبانیت ہے۔ اپنے اہلِ خانہ اور اہلِ حلقہ کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری مثال اس سے بہتر ہے۔ سر شیخ عبدالقادر نے محمود شیرانی کی جفاکشی، سادگی اور آرام سے بے نیازی کی یہ تصویر پیش کی:

''گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کے بعد کا وقت ..... وہ ایک ہلکا سا بنیان پہنے ہوئے تھے اور کمر کے گرد صرف ایک چھوٹا سا تہہ بند باندھے بیٹھے تھے۔ پنکھا، نہ دستی نہ بجلی کا، نہ گرمی سے بچنے کی فکر نہ پروا۔ کتابیں اور وہ، گرد و پیش فرامین اور سکے۔(4)

7. مزاج میں سیمابیت، بے صبری اور عجلت نہ ہو: خاموشی سے دیدہ ریزی کرے اور ممکن ہے اتنی محنت کے بعد بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلے۔

8. محقق کے مزاج میں اعتدال ہونا چاہیے: اگر اسے مبالغہ پسند ہو تو یہ تحقیق کی راہ میں حارج ہوگا۔ یہ نہ ہو کہ جسے پسند کریں، اسے آسمان پر چڑھا دیں۔ جسے ناپسند کریں اسے بالکل کمزور قرار دے دیں۔ بات کو بڑھا چڑھا کر کہنے کی عادت نہ ہونی چاہیے۔ اسے غیر جذباتی انداز میں لکھنا پڑھنا چاہیے۔

9. غرورِ علم نہ ہو، منکسر المزاج ہو: اگر کسی دوسرے کی تحریر سے کوئی مفید معلومات ملتی ہے تو اسے قبول کرنے اور اس کا اعتراف کرنے میں نہ جھجکے۔ کوئی شخص عالمِ کل نہیں ہوتا۔ اگر وہ دوسرے کی غلطی کی گرفت کرے تو احساس برتری سے سرشار ہو کر کسی کا استہزا نہ کرے۔

10. اخلاقی جرأت: کسی کے خوف سے حق گوئی سے باز نہ رہے۔ یہ نہ سوچے کہ فلاں شخص پروفیسر ہے، اس کی غلطی کی نشاندہی کی تو وہ نہ معلوم کس سلیکشن کمیٹی میں زک پہنچائے۔ فلاں یوپی اردو اکادمی کی انعامی کمیٹی کا صدر یا رکن ہے، اس کے معاملے میں زبان بند رکھی جائے ورنہ وہ کتاب پر انعام نہ دے گا۔ فلاں کا مرتبہ بہت بلند ہے اس کی بات سے اختلاف کیا تو اس کے تمام اہلِ صوبہ یا اہلِ فرقہ یا شاگردوں کا جمِ غفیر میرے پیچھے پڑ جائے گا۔

جن افراد یا موضوعات پر لکھنے میں اس قسم کا خدشہ ہو ان پر کام نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ عام طور سے اندیشہ، وسوسہ، خوف و ہراس محقق کی طبیعت کے شایانِ شان نہیں۔

ب۔ ذہنی:

11. غیر مقلد مزاج: مذہب میں ایمان بالغیب اور بیعت جائز ہے، تحقیق میں نہیں۔ امام غزالی کی رائے اور اس پر سرسید کی تائید حسب ذیل ہے:

''ہر ایک محقق کو تحقیق لازم ہے اور اس پر تقلید حرام ہے پھر کیوں کر تحقیق، تقلید ساتھ ہو سکتی ہے۔ یہ تو ایسی بات ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ تجھ کو دیکھنا واجب ہے مگر جو بتایا گیا ہے اس کے سوا مت دیکھ اور اسی کو تحقیق سمجھ اور جو چیز مشتبہ بتائی گئی ہے اس کو مشتبہ سمجھ۔(5)

محسن الملک نے بھی کچھ ایسا ہی کہا ہے۔

''تحقیق کرنے والے کو ہر چیز کی تحقیقات کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ لوگوں سے سنا ہو یا جو کچھ اس نے خود سمجھ رکھا ہو، اس سے اپنے دل و دماغ کو خالی کر لے اور کسی کی حقیقت اور صحت پر پہلے سے یقین نہ کرے اس لیے کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو یا تو تحقیق کرنے پر اس کی توجہ نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ اپنے خیالات کو یقین سمجھ کر اپنے آپ کو مستغنی سمجھے گا، یا تحقیقات کرتے وقت اس کو توہمات اور خطرات ایسے پیدا ہوں گے کہ وہ اس تحقیق میں خلل ڈالیں گے۔''

''ایسی تحقیقات کرنے والے کو چاہیے کہ وہ ان سب باتوں کو جو لوگوں سے سنی ہوں یا جو کچھ اس کے دل میں گزری ہوں پیش نظر رکھے اور بغیر پیدا کرنے یقین کے کسی پر، وہ ان کی تحقیق کرے تاکہ اس کو خود معلوم ہووے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔(6)

12. ضعیف الاعتقاد نہ ہو: اساطیر، توہمات، خرافات، فوق الفطرت، تصورات کے حلقے سے باہر نکلنے کی ہمت رکھتا ہو۔(7)

13. استفہامی مزاج ہو یعنی مشکک ہو: کسی بھی تحریر یا بیان کو قبول کرنے سے پیشتر اس کا تجزیہ کرے۔ اس کے خلاف ممکنہ دلائل پیدا کرے اور ان سے اس بیان یا دعوے کو پرکھے۔

14. اس کے مزاج میں سائنس داں کی سی قطعیت ہو: دو اور دو کو چار ہی کہے۔ جو کچھ جیسا ہے اسے جزئیات کے ساتھ بالکل ویسا بیان کرے۔

15. بہت سے بے ترتیب مواد کو منظم کر سکے اور منطقی اور فلسفی کی طرح شہادت کو پرکھ کر استخراج نتائج کر سکے۔ یعنی اس میں فکری وضاحت ہونی چاہیے۔

16. اس کا حافظہ اچھا ہو۔

17. سکون کے ساتھ ذہن کو کام پر مرکوز رکھ سکے۔

ج۔ علمی اوصاف:

18. نامعلوم کو معلوم کرنے کی کرید ہو۔

19. اردو کے علاوہ دوسری زبانوں سے واقفیت: سب سے اہم فارسی کی واقفیت ہے۔ اردو سے متعلق بیشتر تذکرے، تاریخیں، قدیم لغات، داستانوں اور مثنویوں کے مآخذی نسخے، غرض یہ کہ بہت سا مواد فارسی میں ہے۔ چوں کہ تحقیق بیشتر قدیم ادب کی ہوتی ہے اس لیے فارسی جانے بغیر ایک قدم نہیں بڑھا سکتے۔ انگریزی کی واقفیت بھی ضروری ہے کیوں کہ بہت سے کتب خانوں کی وضاحتی فہرستیں انگریزی میں ہیں۔ ان دو زبانوں کے علاوہ عربی اور ہندی کی واقفیت بھی مفید ہے۔ بعض موضوعات کے لیے بعض مخصوص زبانوں کی استعداد ضروری ہے مثلاً اردو کی ابتدائی لغات و قواعد پر کام کرنے کے لیے پرتگالی، فرنچ، اطالوی وغیرہ، گارساں دتاسی پر کام کرنے کے لیے فرنچ اور صنائع بدائع پر کام کرنے کے لیے عربی کا جاننا ضروری ہے۔

20. تاریخ کا شعور ہو تا کہ ماضی سے گہری واقفیت ہو۔

21. بعض دوسرے علوم: بالخصوص سماجیات اور نفسیات میں نظر ہو تو وہ مفید ثابت ہوگی۔

د۔ ادبی اوصاف

22. ادبی علوم سے واقفیت ضروری ہے: ان میں عروض، تاریخ گوئی، علم بیان اور علم قافیہ آتے ہیں۔ کسی کا کلام مدوّن کرنا ہو تو عروض کی واقفیت بطور خاص ضروری ہے۔ تاریخ گوئی کے غوامض سے آشنائی نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ تاریخ کے غلط اعداد نکال بیٹھیں۔

23. محقق کو کسی حد تک نقاد بلکہ تحقیق کار کی صفات سے بھی متصف ہونا چاہیے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ محقق تحقیقی مقالے کی تسوید میں رومانی، انشا پردازانہ اسلوب اختیار کرے۔ ڈاکٹر تلک سنگھ نے کہا ہے کہ جذباتی اسلوب سے متاثر تحقیق تنقید بن جاتی ہے۔ (7) میری صرف یہ مراد ہے کہ تحقیق ادب کا شعبہ ہے۔ جمالیاتی حس اور تنقیدی نظر کے بغیر تحقیق راہِ مستقیم سے بھٹک سکتی ہے۔ وہ تفہیم ادب کو بھلا کر محض حقائق اندوزی بن کر رہ جائے گی۔

کسی شخص میں مندرجہ بالا خوبیاں جس مقدار میں ہوں گی وہ اتنا ہی کامیاب محقق ثابت ہوگا۔ یہ سب مطالبات پختہ کار محقق سے ہیں۔ لیکن یونیورسٹیوں میں ریسرچ کے لیے داخلہ لینے والوں میں بھی کمی کے ساتھ سہی، انھی اوصاف کی جستجو کی جائے گی۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کے مزاج میں تحقیق کا مادّہ ہو۔ داخلہ لینے والے اسکالر سے پوچھا جائے کہ اس کا تحقیق کا کیا تصور ہے۔ اس کے موضوع میں اب تک یہ جو کام ہوئے ہیں وہ ان سے واقف ہے کہ نہیں، وہ کیا اضافہ کرنا چاہتا ہے؟

دیکھنے میں آیا ہے کہ ریسرچ میں داخلہ لینے والوں کی بڑی تعداد بے روزگاری کے داغ سے بچنے کے لیے وقت گزاری کے طور پر ریسرچ میں داخلہ لے لیتی ہے تا کہ بہتر ڈگری کی بنا پر ملازمت کی کوئی گنجائش نکل سکے۔ امیدوار کا معاشی پہلو اپنی جگہ اہم ہے لیکن اس سے قطع نظر تحقیق کا حق تو ادا نہ ہوگا۔ ہر تعلیمی سال کے شروع میں تحقیق میں داخلہ لینے والوں کی ایک باڑھ آ جاتی ہے۔ ان میں انتخاب کے لیے ان سے کہا جائے کہ جس موضوع پر وہ کام کرنا چاہتے ہیں اس پر پندرہ بیس صفحوں کا مضمون لکھ کر لائیں۔ بہت سے امیدوار اس گھاٹی سے سرخ رو نہ نکل سکیں گے۔ تحقیق میں پوری کتاب لکھنی ہوتی ہے۔ اس کی ابتدا سے پہلے ایک مختصر مضمون لکھنے کی صلاحیت تو ہونی ہی چاہیے۔

نئے ریسرچ اسکالر کا مزاج تحقیق سے دلچسپی، حق گوئی اور بے تعصبی کا ہو۔ دوسرے اوصاف آہستہ آہستہ پیدا ہوتے جائیں گے۔ جوں جوں وہ تحقیق میں چلے گا، توں توں اس میں مواد تلاش کرنے، پرکھنے اور ترتیب دینے کی صلاحیت پیدا ہوتی جائے گی۔

حواشی:

1. سہ ماہی، ساغر، پٹنہ، جولائی 1964
2. ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، ص 77-68
3. C-V-Good and D.E. Scates, Methods of Research (New York, 1954) P-56
4. سر شیخ عبدالقادر، حافظ محمود شیرانی مرحوم، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، جلد 23، عدد، ص 7 بحوالۂ مبادیاتِ تحقیق، ص-14
5. انظر فی رسالۃ الامام حجۃ الاسلام ابوحامد محمد غزالی ''المسمّی بالتفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ'' (مطبع فیض عام علی گڑھ) ص-15، بحوالۂ ڈاکٹر محمود الٰہی ''اردو میں جدید تحقیق کا آغاز، سرسید اور ان کے بعض رفقا'' مشمولۂ ادبی اور لسانی تحقیق، ص 186
6. محسن الملک، تہذیب الاخلاق، جلد اول (مطبع کریمی لاہور، جولائی 1934) ص 2 بحوالۂ مضمون ڈاکٹر محمود الٰہی محولۂ بالا۔
7. ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ''اردو میں تحقیق کی روایت اور قاضی عبدالودود'' غالب نامہ، نئی دہلی، جنوری 1987، ص 118
8. نوین شودھ وگیان، ص 21

□□□

اردو خبر نامہ

ممبئی میں قومی [illegible] کونسل کا [illegible] کل ہند اردو کتاب میلہ

● ممبئی، 17/ جنوری 2009۔ کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی کے کل ہند اردو کتاب میلے کا افتتاح اردو کے معروف شاعر جناب ندا فاضلی نے ایم ایچ صابو صدیق پالیٹکنک گراؤنڈ، بائی کلا میں کیا۔ یہ قومی اردو کونسل کا دسواں کل ہند اردو کتاب میلہ اور ممبئی میں کونسل کا تیسرا کل ہند اردو کتاب میلہ تھا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالستار دلوی نے کی، مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود الرحمن، چیئرمین، اقلیتی اسٹڈی گروپ، حکومت مہاراشٹر تھے اور قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد بھی ڈائس پر موجود تھے۔ اس اجلاس کی نظامت جناب جاوید رحمانی نے کی۔ جناب ندا فاضلی نے اپنی افتتاحی تقریر میں صوبہ جاتی عصبیت کی سخت مذمت کی اور کہا کہ ہندوستان کا ہر شہری ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر شہر میں رہ سکتا ہے اور کسب معاش کر سکتا ہے، وہ ذہن جو اس پر پابندی عائد کرنا چاہے وہ ہندوستانی سالمیت کا دشمن ہے اور ہمیں اس کی مذمت کرنی چاہیے۔ انھوں نے اردو کو محبت کی زبان بتایا اور کہا کہ ہندوستانی سالمیت کی سب سے بڑی محافظ اردو ہے اگر یہ نہ ہوتی تو کملیشور مرحوم کو ''کتنے پاکستان'' کی طرح ''کتنے ہندوستان'' بھی لکھنے کی ضرورت پیش آتی۔ ڈاکٹر محمود الرحمن نے اپنی تقریر میں کتابوں کی اہمیت اور اردو زبان کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور بتایا کہ قومی اردو کونسل کا یہ پروگرام جس کو کل ہند اردو کتاب میلہ کہتے ہیں اس لحاظ سے بیحد اہم ہے کہ یہ ملک کے دور دراز کے خطوں میں بھی اردو کتابوں کو پہنچاتا ہے۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر عبدالستار دلوی نے انجمن اسلام ممبئی کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور قومی اردو کونسل کے اشتراک سے منعقد کیے جانے والے اس میلے کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی۔ آخر میں قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

● کل ہند اردو کتاب میلے کے دوسرے دن صبح 11.00 بجے سے ہی مختلف اسٹالوں پر لوگوں کا آنا شروع ہو گیا اور ممبئی اور اطراف کے لوگوں نے جوش و خروش کے ساتھ کتابوں کی خریداری کی۔ اس کتاب میلے میں ہندوستان کے تقریباً 60 اہم ناشرین نے اپنی کتابیں نمائش و فروخت کے لیے رکھی تھیں جن میں زبان و ادب، مذہب، تہذیب و ثقافت اور دیگر موضوعات سے متعلق نئی اور پرانی کتابیں شامل تھیں۔ میلے کے دوران تہذیبی و ثقافتی پروگرام بھی پیش کیے جاتے رہے۔ آج گل بوٹے، ممبئی نے بچوں کا پروگرام ''میرا خواب'' پیش کیا جس کو بہت سراہا گیا۔ یہ پروگرام 2.00 بجے شروع ہوا اور تقریباً 3.30 بجے تک چلتا رہا۔ اس انعامی مقابلے کے جج جناب آفتاب حسنین، جناب منصف قریشی اور جناب قطب الدین شاہد تھے۔ جونیر گروپ کا پہلا انعام فلک ناز سمیع اللہ (انجمن خیر الاسلام، پرائمری اسکول، ممبئی) کو دیا گیا جب کہ دوسرا انعام قریشی حمیرا فیض (کمو جعفر گرلز پرائمری اسکول، ممبئی) اور تیسرا انعام انصاری ثمرہ محمد اسلم (انجمن خیر الاسلام پرائمری گرلز اسکول، مدن پورہ، ممبئی) اور شیخ زرین ظفر الحق (انجمن شان اسلام، ساکی نالہ، ممبئی) کو دیا گیا سینئر گروپ کا پہلا انعام انصاری منزہ رضوان احمد (انجمن خیر الاسلام گرلز ہائی اسکول، مدن پورہ، ممبئی)، دوسرا انعام شیخ اظہر احمد نظیر احمد (الاتحاد اردو ہائی اسکول، جوگیشوری، ممبئی) اور تیسرا شیخ سکینہ جمیل احمد (انجمن خیر الاسلام گرلز ہائی اسکول، ممبئی) کو دیا گیا۔ اس کے بعد مختلف اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ و طالبات نے بیت بازی کا پروگرام پیش کیا جس میں انجمن خیر الاسلام ڈی ایڈ کالج، کرلہ، ممبئی، انجمن اسلام اکبر پور بھوئی کالج، ممبئی انجمن اسلام ٹریننگ کالج، کرلہ، مہاراشٹر کالج، ممبئی رویال کالج، میرا روڈ، ممبئی اور نور الاسلام ٹریننگ کالج ممبئی کے طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔

● کل ہند اردو کتاب میلے کے تیسرے دن بھی تمام اسٹالوں پر کتابوں کی خریداری میں مصروف طلبہ و اساتذہ اور دوسرے پیشوں سے وابستہ افراد بڑی تعداد میں موجود رہے۔ صبح 11.00 بجے سے ایم ایچ صابو صدیق پالیٹکنک کے المطلبی ہال میں کوئز کا پروگرام منعقد کیا گیا جس میں اردو میڈیم اسکولوں کے طلبہ و طالبات نے اپنی جنرل نالج کا مظاہرہ کیا۔ اس جنرل نالج کوئز مقابلے میں انجمن اسلام ڈاکٹر محمد اسحق جمخانہ والا گرلز ہائی اسکول، باندرہ کی خان قدسیہ افضال الحق اور خان نکہت قطب الدین نے پہلا انعام حاصل کیا۔ دوسرا انعام مدنی ہائی اسکول فار بوائز جوگیشوری کے نسیم نظام الدین اور خان محمد صفدر نے حاصل کیا اور تیسرا انعام انجمن اسلام سی ایس ٹی اردو ہائی

اسکول کی خان کلثوم فاطمہ عبدالعزیز اور ارشاد احمد سراج اللہ خان نے حاصل کیا۔ اس کے بعد انٹر کالج تقریری مقابلے کا انعقاد کیا گیا جس میں ممبئی کے اہم کالجوں کے طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔ شام 6.00 بجے اقبال نیازی کا مشہور ڈراما ''یہ کس کا لہو ہے'' پیش کیا گیا۔ اس ڈرامے کی تقریباً پندرہ سو نمائشیں ہندوستان کے اہم شہروں میں ہو چکی ہیں۔

● کتاب میلے کے چوتھے دن ممبئی اور اطراف کے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ و طالبات سے تمام بک اسٹالوں پر گہما گہمی رہی، خصوصاً ان اسٹالوں پر جن پر مذہبی کتابیں زیادہ تعداد میں موجود تھیں۔ اس سے نوجوانوں کے مذہب کی طرف میلان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سی ڈی اسٹال نے بھی طلبہ و طالبات کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا۔ میلے میں کچھ اسٹالوں پر امیر خسرو سے متعلق وہ نایاب سی۔ ڈی بھی تھی جس میں امیر خسرو پر ظ۔ انصاری کا تیار کیا ہوا فیچر اور خسرو کی غزلیں اہم گلوکاروں کی آواز میں موجود ہیں۔ ایم۔ ایچ۔ صابو صدیق پالیٹکنک، بائیکلہ، ممبئی کے المالطیفی ہال میں آج شام 6.00 بجے ایک پروگرام ''ایک شام مشاہیر کے نام'' منعقد ہوا جس میں اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب انور قمر اور معروف شاعر جناب یعقوب راہی مدعو تھے۔ انھوں نے اپنے فکر و فن پر اظہار خیال فرمایا۔ اس کے بعد سامعین نے ان کے نظریۂ فن کے حوالے سے سوالات کیے جن کے جناب انور قمر اور یعقوب راہی نے جواب بھی دیے۔ جناب ساجد رشید نے اپنی صدارتی تقریر میں انور قمر کی افسانہ نگاری، یعقوب راہی کی شاعری اور سامعین کے استفسارات پر اظہار خیال کیا۔ اس پروگرام کی نظامت جناب وقار قادری نے کی۔ سامعین میں جناب عبدالاحد ساز، جناب ظفر گورکھپوری، جناب الیاس شوقی، جناب اقبال نیازی، ڈاکٹر ابوبکر عباد (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی اردو کونسل)، ڈاکٹر عائشہ شیخ اور شہر کی کئی معزز شخصیات موجود تھیں۔ اس کے بعد المالطیفی ہال میں ہی بچوں کے شاعروں کا مشاعرہ منعقد ہوا جس کے شاعروں میں جناب عبدالاحد ساز اور جناب ظفر گورکھپوری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

● پانچویں دن اردو کتاب میلے کے تمام اسٹالوں پر کچھ زیادہ ہی چہل پہل اور رونق دیکھنے میں آئی جس کا سبب ممبئی کے اردو میڈیم اسکولوں کے طلبہ و طالبات کا میلہ دیکھنے کے لیے آنا تھا۔ ان طلبہ و طالبات نے تمام اسٹالوں کی کتابوں کو دیکھا اور پسند کی کتابیں خریدیں بھی۔ اسکولوں نے اساتذہ کی نگرانی میں بچوں کو کتابوں کی خریداری کے لیے بھیجا تھا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد نے ان اسکولوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسرے اسکولوں کے ذمے داران سے بھی درخواست کی کہ وہ اپنے طلبہ و طالبات کو اس کتاب میلے کی نمائش میں شرکت کے لیے بھیجیں تاکہ بچوں میں اردو کے مطالعے سے شغف بڑھے اور اردو کی نئی نسل زیادہ سے زیادہ باخبر اور ذمے دار شہری کی حیثیت سے سامنے آئے۔ آج میلے میں کئی اخباروں کے ذمے داران بھی تشریف لائے جن میں ''انقلاب'' اور ''اردو ٹائمز'' کے عہدے داران خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر کے ہمراہ تمام اسٹالوں کی کتابوں کا جائزہ لیا اور قومی اردو کونسل کے اس قدم کو سراہا۔ قومی اردو کونسل نے پہلا اردو کتاب میلہ 2000 میں دہلی کے لال قلعہ میدان میں منعقد کیا تھا۔ اس کا جس گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا اس کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے ملک کے مختلف شہروں میں ہر سال اردو کتاب میلہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ کتاب میلے دہلی، ممبئی، سری نگر، حیدرآباد، لکھنؤ، کولکاتا اور پٹنہ میں منعقد کیے جا چکے ہیں۔ ممبئی میں یہ تیسرا کل ہند اردو کتاب میلہ تھا۔ اس میلے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں روزانہ ایسے کلچرل پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جو ہندوستان کے مشترکہ کلچر کے خد و خال کو روشن کر سکیں۔ اس سلسلے میں آج شام 6 بجے سے ایم۔ ایچ۔ صابو صدیق پالیٹکنک، بائیکلہ کے المالطیفی ہال میں ایک مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت جناب ممتاز راشد نے کی اور جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان میں ارتضیٰ نشاط، سعید راہی، عبدالاحد ساز، جاوید رحمانی، ندیم صدیقی، احمد وصی، شفیع ساغر، یعقوب راہی، شفیق عباس، اختر جمال، وسیم الماس، جاوید ندیم، شمیم طارق، عرفان جعفری، قاسم امام، شاہد لطیف اور حامد اقبال صدیقی شامل تھے۔ اس مشاعرے کی نظامت جناب عرفان جعفری نے کی۔

● کل ہند اردو کتاب میلے کے چھٹے دن بھی کئی اسکولوں کے طلبہ اپنے اساتذہ کے ساتھ میلے میں آئے اور اپنی پسند اور ضرورت کی کتابیں خریدیں۔ طلبہ و طالبات نے ان اسٹالوں پر زیادہ توجہ دی جن میں ادب اطفال کا ذخیرہ زیادہ تھا۔ ان میں انجمن اسلام اردو ہائی اسکول، وی ٹی ممبئی اور انجمن اسلام الانا انگلش پرائمری اسکول، سی ایس ٹی ممبئی اور مولانا آزاد اردو ہائی اسکول، بائیکلہ، ممبئی کے طلبہ و طالبات شامل تھے۔ قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد نے ان تمام اسکولوں کے صدور کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح بچوں میں مطالعے کا شوق پروان چڑھتا ہے جو نہ صرف اردو ادب کے لیے بلکہ اس ملک کے لیے اور اس دنیا کے لیے بھی ایک بڑی نعمت ہے۔ کلچرل پروگرام کے تحت آج 11.00 بجے صبح سے ایک سیمینار شام 5.00 بجے تک چلا جس کا موضوع تھا: ''مہاراشٹر میں اردو ذریعۂ تعلیم'' اس سیمینار کی صدارت جناب منور پیر بھائی نے کی اور جناب

عبدالکریم سالار، جناب بشیر انصاری، جناب غلام نبی مومن، جناب قاسم امام، جناب رشید قاسمی، جناب محمد حسن فاروقی، جناب سکندر احمد، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، جناب جاوید رحمانی اور ڈاکٹر ابوبکر عباد وغیرہ نے اردو ذریعۂ تعلیم اور مہاراشٹر اور ہندوستان میں اردو نظام تعلیم کو درپیش مسائل پر روشنی ڈالی اور اس سلسلے میں کچھ تجاویز بھی پیش کیں۔ شام 5.00 بجے ایک سیمینار بعنوان "بچوں کا ادب" منعقد کیا گیا یہ دونوں سیمینار الما لطیفی ہال (ایم ایچ صابو صدیق پالٹکنک، بائیکلہ، ممبئی) میں ہوئے اور ان کے بعد ایک ڈراما "اس آگ کو بجھا دو" پیش کیا گیا۔ یہ ڈراما اردو گرلز ہائی اسکول، پونہ کی طالبات نے پیش کیا۔

● کل ہند اردو کتاب میلے میں آج فلمی دنیا کی مشہور شخصیت جناب فاروق شیخ نے بھی اسٹالوں پر کتابوں کی نمائش دیکھی اور چند کتابیں خریدیں بھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا یہ میلہ نہ صرف عوام بلکہ خواص میں بھی مقبول ثابت ہوا ہے۔ مختلف اسٹالوں کے ذمے داران نے کتابوں کی فروخت کو بھی تشفی بخش بتایا۔ کلچرل پروگرام کے سلسلے میں آج شام 6.00 بجے "ایک شام پریم چند کے نام" آئیڈیل ڈراما اینڈ انٹرٹینمنٹ اکیڈمی (IDEA)، ممبئی کی طرف سے پیش کی گئی جس میں پریم چند کی تین اہم کہانیوں "بوڑھی کاکی"، "سچائی کا ابھار" اور "شکوہ شکایت" کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا۔

● قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کل ہند اردو کتاب میلے میں آج بھی مختلف اسکولوں کے طلبہ و طالبات نے کتابوں کی نمائش دیکھی اور کتابیں خریدیں۔ آج ان میں مولانا آزاد ہائی اسکول، آگری پورہ پولیس چوکی، ممبئی اور تاڈیو میونسپل اردو اسکول، ممبئی کے طلبہ و طالبات شامل تھے۔ 24/جنوری 2009 کو کلچرل پروگرام کے تحت دو اہم پروگرام پیش کیے گئے پہلا شام 4.00 بجے "شام افسانہ" کے نام سے منعقد ہوا جس میں جناب اشتیاق سعید، جناب مظہر سلیم اور جناب م۔ ناگ نے اپنی کہانیاں سنائیں اور ان پر مباحثے میں جناب وقار قادری، جناب اقبال نیازی، ڈاکٹر ابوبکر عباد، جناب مقدر حمید، جناب ساجد رشید، جناب انور قمر اور جناب سلام بن رزاق نے حصہ لیا۔ اس پروگرام کی صدارت جناب ساگر سرحدی نے کی اور نظامت جناب رحمٰن عباس نے۔ اس کے بعد محفل غزل کا انعقاد عمل میں آیا جس میں مشہور غزل سنگر محترمہ خوشبو خانم نے میر تقی میر، فیض احمد فیض، احمد فراز اور قیصر الجعفری کی غزلیں اپنے مخصوص انداز میں سنائیں اور سامعین ہمہ تن گوش ان غزلوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

● آج 25 جنوری، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا کل ہند اردو کتاب میلہ اپنے شاندار اختتام کو پہنچا۔ میلے میں تقریباً 35 لاکھ کی کتابیں فروخت ہوئیں جو اس لحاظ سے بیحد اہم ہے کہ قومی کونسل ممبئی میں پہلے بھی دو کتاب میلے منعقد کر چکی ہے اور اس میں کم و بیش انھیں پبلیشروں نے حصہ لیا تھا۔ میلے میں روزانہ مختلف اوقات کے کلچرل پروگرام مختلف اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ و طالبات نے پیش کیے۔ ان تمام طلبہ و طالبات کو قومی کونسل کی طرف سے پارٹی سپیشن/میرٹ سرٹیفکیٹ دیے گئے جو بچے سرٹیفکیٹ لینے نہیں پہنچ سکے انھیں ہدایت دی گئی ہے کہ وہ کل یونٹ، ممبئی کے دفتر سے حاصل کر لیں۔ آج شام 3.00 بجے الما لطیفی ہال میں تاردیو میونسپل اردو اسکول کے طلبہ و طالبات نے ایک ڈراما "ہمیں پڑھنے دو" کے نام سے پیش کیا جس کے ڈائرکٹر جناب صغیر احمد اور مصنف جناب رفیق گلاب تھے۔ میلے کا اختتامی اجلاس اسی ہال میں شام 4.00 بجے منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر صاحب علی نے کی۔ مہمانان خصوصی جناب زماں حبیب اور جناب ساجد رشید تھے اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد نے مہمانان کا تعارف کرایا اور اس کتاب میلے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کی نظامت جناب جاوید رحمانی نے کی۔ اس اجلاس میں ان طلبہ و طالبات کو انعامات بھی دیے گئے جنھوں نے کلچرل پروگرام میں پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس میلے میں جن پبلیشروں نے اپنی کتابیں نمائش کے لیے رکھی تھیں ان میں سے بیسٹ ڈیکوریٹیڈ اسٹال کا انعام رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں کو دیا گیا اور بیسٹ کلیکشن کا انعام ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی کو۔ ان انعامات کی تقسیم پروفیسر صاحب علی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کے بعد مہمانان خصوصی میں سے جناب زماں حبیب نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا کہ اردو کی مقبولیت کا اندازہ اس اردو کتاب میلے میں عوام کی بھیڑ سے ہوتا ہے جو جوق در جوق کتابوں کی خریداری میں دس دن تک مصروف رہی۔ ان کے بعد اجلاس کے دوسرے مہمان خصوصی جناب ساجد رشید نے اپنی تقریر میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اس میلے میں مقامی حضرات نے اس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لیا جس طرح قومی کونسل کے ہی پہلے دو کتاب میلوں میں لیا تھا انھوں نے اہل اردو سے درخواست کی کہ وہ اپنی مادری زبان اردو کے تعلق سے اپنی ذمے داریوں کو محسوس کریں۔ پروفیسر صاحب علی نے اپنی صدارتی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ اہل اردو احساس کمتری سے اپنے آپ کو الگ کریں اور سنجیدگی سے اپنی مادری زبان کی تعلیم اور ترویج و اشاعت میں حصہ لیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر ابوبکر عباد، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر کا ان کے پُر خلوص تعاون کے لیے شکریہ ادا کیا۔ انھوں

نے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی اور انجمن اسلام ممبئی کا بھی شکریہ ادا کیا جن کے اشتراک سے یہ میلہ منعقد کیا گیا تھا۔ (ڈاک سے)

[illegible] زبان، تہذیب، ثقافت [illegible] لہجہ

● نئی دہلی۔ 06 فروری، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ کے زیر اہتمام آج نہرو گیسٹ ہاؤس کے کمیٹی روم میں 'ڈی آر ایس فیز (1) کے پانچ یں سہ روزہ قومی سیمینار کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر افتخار احمد نے کی۔ اس موقع پر 2 کلیدی خطبات پیش کیے گئے، ان میں پہلے خطبے کا موضوع ''ترجمہ نگاری میں لسانیات کا کردار'' تھا جو پروفیسر اے. آر. فتیحی نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ مغل بادشاہوں نے ترجمے کی اہمیت کے پیش نظر دارالترجمہ قائم کیا جس کی روایت بعد کے زمانوں میں مختلف سلطنتوں اور بادشاہوں نے باقی رکھی۔ انھوں نے کہا کہ ترجمہ کا دوسرا اہم دور، برطانوی دور میں فورٹ ولیم کالج کا قیام ہے۔ انھوں نے اس حوالے سے آزاد ہندوستان کے بعض اداروں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ترجمہ دراصل لسانی منتقلی ہے البتہ انگریزی زبان بعض تہذیبی الفاظ کے ترجمے میں انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ ذرائع ابلاغ اور اردو زبان پر سعید نقوی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کی تہذیب، ثقافت اور لہجے نے آج بھی اس کو نہ صرف بلند کر رکھا ہے بلکہ میڈیا میں آج انھی کا جادو چل رہا ہے جن کا لہجہ اور زبانی تہذیب اردو سے قریب ہے۔ جناب نقوی نے کہا کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو میں اردو کے لیے مزید راہیں کھلیں گی البتہ انھوں نے برقی میڈیا کے عام رویے کی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا قومی میڈیا ایک طرح سے مغرب کی نقالی میں معروف ہے اور اپنی زبان، تہذیب اور ثقافت کو خود اپنے لوگ ختم کرنے پر آمادہ ہیں۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر افتخار احمد نے کہا کہ میڈیا میں اردو کے رول سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو آبادی کو ایک جامع منصوبے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے اس موقع پر شعبہ کے طلبہ کو بطور خاص نصیحت کی کہ یہاں پر جن امور کا تذکرہ کیا جا رہا ہے ان کو ابھی سے اپنائیں اور ترجمے کی عملی راہوں میں جن دقتوں کا جناب فتیحی نے اپنے خطبے میں ذکر کیا ان پر بطور خاص توجہ دیں۔ پروگرام کے کوارڈی نیٹر پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے حاضرین اور مہمانوں کا استقبال کیا اور کہا کہ یو. جی. سی. کے اس پروجیکٹ کا مقصد یہی ہے کہ طلبہ کے لیے نئی راہیں کھلیں اور ادب کے ساتھ ساتھ میڈیا اور ترجمے کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکیں۔ نظامت ڈاکٹر شہزاد رسول نے کی جبکہ شاہنواز فیاض نے تلاوت کلام پاک سے جلسے کا آغاز کیا۔

● نئی دہلی۔ 7 فروری، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام سیمینار ہال میں آج ڈی. آر. ایس. فیز (ایک) کے پانچ یں سہ روزہ قومی سیمینار کے 2 اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت ماس کمیونکیشن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈائرکٹر پروفیسر افتخار احمد اور دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے کی جب کہ نظامت عمیر منظر نے کی۔ پروفیسر غضنفر نے ریڈیو فیچر نگاری پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ تخلیقیت فیچر کو زیادہ با معنی اور پر اثر بناتی ہے۔ ریڈیائی فیچر کا سب سے اہم حربہ آواز کی جادوگری ہے۔ ڈاکٹر صفدر امام قادری نے ڈرامے کی عوامی روایت کا فروغ اور نوٹنکی کی زبان کے حوالے سے مقالہ پڑھا۔ پروفیسر شفیق اللہ نے ''لغت نویسی کے تقاضے اور ہمارے اردو انگریزی لغات ایک تقابلی مطالعہ'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے لغت کو زبان کے محفوظ رکھنے کا ذریعہ قرار دیا اور کہا کہ زبان سے گہری واقفیت کے بغیر لغت نگاری کا کام بہتر انداز سے نہیں ہو سکتا۔ پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے اردو میں دیگر زبانوں کے ترجمے کی روایت پر مقالہ پڑھا اور کہا کہ ہمارے یہاں ترجمے کی ایک مضبوط اور جامع روایت رہی ہے جسے مزید استحکام کی ضرورت ہے۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر افتخار احمد نے میڈیا کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی اور کہا کہ میڈیا رہنمائی اور روشنی کے بجائے کسی اور سمت میں گامزن ہو گیا ہے۔ انھوں نے اردو والوں سے اپیل کی کہ وہ میڈیا کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو آزمائیں۔ پروفیسر قمر رئیس نے اجلاس میں پڑھے گئے مقالوں کی ستائش کرتے ہوئے تراجم کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ اب جو مشینی ترجمے کا دور شروع ہوا ہے یہ بلاشبہ قابل قدر ہے مگر تخلیقی ادب کا ترجمہ کرنا مشینوں کے لیے مشکل ہے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اور پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے اور نظامت ڈاکٹر احمد کفیل نے کی۔ اس اجلاس میں عمیر منظر نے ڈاکٹر سید عابد حسین کی صحافت پر (نئی روشنی کے حوالے سے) مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ عابد حسین نے صحافت کے ذریعے قوم و ملت کی ذہنی اور معاشرتی بیداری کا چراغ روشن کیا تھا۔ ڈاکٹر خالد جاوید نے ٹیلی ویژن اور پاپولر کلچر کے حوالے سے مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ ٹیلی ویژن معلومات اور اپنے ابتدائی نکات کے بجائے ایک ایسی دنیا میں داخل ہو چکا ہے جہاں صرف اور صرف اعلیٰ طبقات کی نمائندگی ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر شہزاد انجم نے ''آہنگ'' اور ''مورچہ'' کی ادبی و صحافتی خدمات پر مقالہ پڑھا، جن کے ایڈیٹر کلام حیدری تھے۔ انھوں نے مختلف حوالوں سے بتایا کہ کلام حیدری کی شخصیت

اپنے آپ میں ایک انجمن تھی۔

آخر میں فرحت احساس نے میڈیا کے حوالے سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ میڈیا کو اب اپنے مقاصد کے تحت کنٹرول کیا جانے لگا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا تاجروں کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے جہاں اب ہر چیز برانڈ (شے) میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔ میڈیا کے رول ماڈل میں ادب، فلسفہ اور تخلیقی ادب کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ''آہنگ'' اور ''نئی روشنی'' کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ ان اخبارات میں اس زمانے کے تقریباً تمام اہم لوگوں کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ میڈیا کی موجودہ بے راہ روی کے سیلاب کو زبان و ثقافت کے مضامین ہی روک سکتے ہیں۔ سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر شہپر رسول نے کہا کہ یہ بہت خوش آئند بات ہے کہ میڈیا کے ہر رخ کا نہایت کھلے ذہن سے تجزیہ کیا جا رہا ہے جس کا سب سے زیادہ فائدہ ہمارے طلبہ کو پہنچے گا۔

● نئی دہلی۔ 8 فروری، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام آج سیمینار ہال میں ڈی. آر. ایس. فیز (1) کے پانچویں سہ روزہ قومی سیمینار کے آخری دن 2 اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شہناز انجم اور پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمران احمد عندلیب نے انجام دیے۔ مسعود الحق نے ''فکشن کے ترجمے کے عملی مسائل'' (ویکوم محمد بشیر کے حوالے سے) پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ ویکوم محمد بشیر کی کہانیوں کے تراجم میں مجھے کوئی دشواری نہ ہونے کا سبب دراصل یہ ہے کہ ان کی زیادہ تر کہانیاں مسلم گھرانوں اور مسلم کرداروں کے گرد گھومتی ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے ''اداریہ نگاری کا جائزہ'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا اور اداریے کے موضوعات اور اداریہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے روزناموں اور سہ روزہ اخباروں کے مدیران نے اپنی جرأت و بے باکی، قوم پرستی، وطن دوستی اور جرأت اظہار سے اپنے اخبارات کے اداریوں کو اردو صحافت کا نشان امتیاز بنا دیا تھا۔

فرحت احساس نے ''بدن زبان کے تہذیبی تنوع کا مطالعہ'' پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ بدن زبان انسانوں کے درمیان ترسیل کی ان کوششوں اور وسیلوں پر مشتمل ہے جو جسم کی حرکات و سکنات یا اشاروں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تمام ترسیلی کوششوں میں ''بدن زبان'' کا تناسب 50 سے 80 فیصد تک قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے ''شعر غالب کے انگریزی تراجم'' پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ غالب کے شعروں کو انگریزی میں منتقل کرنا بہت مشکل کام ہے کیوں کہ شاعری کا ترجمہ تقریباً ناممکن ہے۔ ڈاکٹر مظہری نے یوسف حسین خان، اعجاز احمد، پون کمار ورما، پروفیسر محمد ذاکر، قرۃ العین حیدر، سردار جعفری اور ڈیوڈ میتھوز کے تراجم کا نہ صرف ذکر بلکہ محاکمہ بھی کیا۔ ثاقب عمران نے ''میڈیا اور خواتین'' کے موضوع پر مقالہ پڑھتے ہوئے ''خاتون دکن''، ''روشنی'' اور ''روشنی'' نامی رسالوں پر بطور خاص گفتگو کی۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر شہناز انجم نے کہا کہ مجموعی طور پر یہ بہت کامیاب اجلاس ہوا کیوں کہ مقالوں کے ساتھ ساتھ ان پر بہت سیر حاصل گفتگو ہوئی جس میں طلبہ نے نہایت سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے شعری تراجم کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ دراصل لفظ کو تو منتقل کیا جا سکتا ہے مگر خیال کو منتقل کرنا ایک بہت پیچیدہ معاملہ ہے، اسی لیے اب تک شاعری کے کامیاب ترجمے ہمیں کم ہی ملتے ہیں۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمس الحق عثمانی اور پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر ندیم احمد نے انجام دیے۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی ''افسانہ ناول اور ڈراما کاغذ سے سلولائڈ تک'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے بیدی کے ڈرامے ''نقل مکانی اور فلم دستک'' کے کئی لطیف و نازک پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے اسٹیج ڈرامے اور فلم تکنیک پر روشنی ڈالی۔ سہیل انجم نے ''برقی ذرائع ابلاغ سے اردو کا استفادہ'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر احمد محفوظ نے ''جدید زندگی سے متعلق اصطلاحات کے اردو متبادلات'' کے موضوع پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ جس طرح عالمی پیمانے پر انگریزی ہمارے اجتماعی شعور کا حصہ بنتی جا رہی ہے اس سے انکار ممکن نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں ہے اور نہ ہم اس کا استعمال عام بول چال میں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے ''اردو میں وضع اصطلاحات اور ان کی نمونہ سازی'' پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ اردو خصوصاً ذرائع ابلاغ میں پیشہ ورانہ سطح پر دخیل ہے مگر اس کا اعتراف نہیں کیا جاتا نیز یہ کہ اردو سے ہمدردی جتا کر ایک طبقہ اپنے جذبۂ ترحم کی تسکین کرتا ہے۔ انھوں نے اس طرف اشارہ کیا کہ اردو کا سرمایۂ الفاظ بہت وسیع ہے جس میں حسب ضرورت و موقع الفاظ و تراکیب وضع کرنا ممکن ہے اور یہ عمل زبان کے فروغ کے لیے ضروری ہے۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ اس سہ روزہ سیمینار میں ماس میڈیا اور ترجمہ نگاری کے ساتھ ساتھ اردو کا ذکر بار بار ہوا اور اردو زبان کے سلسلے میں مدارس کے کردار کا بھی ذکر ہوا لیکن اس سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مدرسہ اردو و رسم الخط کی حفاظت تو ضرور کر رہا ہے مگر ادبی فہم تک رسائی کے لیے جو خاص قسم کی تربیت ہوتی ہے وہ یہاں نہیں ہو رہی ہے کیوں کہ مدارس میں اردو زبان

پڑھانے والے اساتذہ کا تقرر نہیں ہوتا۔ آخر میں پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے سہ روزہ سیمینار کی جامع رپورٹ پیش کی اور ڈاکٹر شہپر رسول نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا نیز طلبہ کی گرم جوشی اور غیر معمولی دلچسپی کو انھوں نے خوش آئند مستقبل سے تعبیر کیا۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا"، دہلی)

ادب میں ترجمے کی اہمیت

● ممبئی۔ 14 جنوری، ترجمہ ادب میں سانس لینے کی طرح ناگزیر ہے۔ اس سے ادبی روایت میں تنوع اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ عالمی ادب سے آگہی ہو یا ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے بارے میں جانکاری یہ، سب ترجمے کے براہِ راست یا بالواسطہ عمل سے متعلق ہے اور ترجمہ کا ناگزیر ہونا مسلم ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ چار روزہ ترجمہ ورکشاپ کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔

پروفیسر نارنگ نے کہا کہ ترجمہ کرتے وقت فقط الفاظ پر نظر رکھنا ضروری نہیں ہوتا، تہذیبی اور معاشرتی تصورات اور نشانات کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے۔ انھوں نے روزمرہ اور محاورے کی اہمیت پر بھی زور دیا جو ہر زبان کے مزاج سے مخصوص ہے۔ اس موقع پر ساہتیہ اکادمی کی ڈپٹی سکریٹری رینو موہن بھان اور اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر عنبر بہرائچی اور صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی پروفیسر صاحب علی نے بھی اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر معزہ دلوی نے اظہار تشکر کیا۔ اس ورکشاپ میں عنبر بہرائچی کے علاوہ ساجد رشید، شوئل احمد، نظام صدیقی، ف۔ س۔ اعجاز، ڈاکٹر سیما صغیر، ڈاکٹر وسیم بیگم اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید وغیرہ شرکت کر رہے ہیں۔ اس موقع پر یوسف ناظم، انور قمر، مقدر حمید، وقار قادری، الیاس شوقی، فیاض احمد فیضی، ریحانہ اندرے، ڈاکٹر سعیدہ پٹیل، اسلم خاں، سلام بن رزاق، اسلم پرویز، قاسم ندیم، رحمٰن عباس، ڈاکٹر خورشید عالم، ڈاکٹر صادقہ نواب سمیت متعدد سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا"، دہلی)

[illegible]

● علی گڑھ۔ 19 جنوری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اردو اکادمی کے زیر اہتمام اساتذہ کے لیے اردو زبان و ادب کے تدریسی عمل پر منعقدہ ترتیبی پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی بھیک شکشا ادھیکاری، ڈاکٹر مکیش کمار سنگھ نے کہا کہ کسی بھی زبان کو مذہب سے جوڑ کر نہیں بلکہ ایک مضمون کی شکل میں دیکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اپنی شیرینی کی وجہ سے ہمیشہ سے ہی مقبول رہی ہے اور یہ اردو اساتذہ کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اس زبان کی خدمت کے لیے دور دراز کے علاقوں میں جانے میں بھی کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کریں۔ ڈاکٹر مکیش کمار نے اساتذہ سے کہا کہ ان میں تمام عمر سیکھنے کی چاہ میں کمی نہیں آنی چاہیے اور ان کو وقت بہ وقت اپنا احتساب بھی کرنا چاہیے۔ پروگرام کے اعزازی مہمان پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اردو ہندی ایسی دو زبانیں ہیں جو آپس میں سب سے زیادہ قریب ہیں مگر سیاسی اسباب سے کچھ لوگوں نے ان میں ہمیشہ دوری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مظفر حنفی نے کہا کہ آج زبانوں کے تئیں طلبہ کی دلچسپی میں کمی واقع ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے متعدد زبانوں کے شعبہ جات نہ صرف چھوٹے ہو رہے ہیں بلکہ سمٹتے بھی جا رہے ہیں۔ زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ میں ان کے تئیں دلچسپی پیدا کی جائے اور آسان زبان میں ان کو تعلیم دی جائے۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ہمارے ملک میں بنیادی تعلیم پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی دیگر ممالک میں دی جا رہی ہے۔ آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ اساتذہ سب سے پہلے زبان کے تئیں شعور پیدا کریں اور زبان کو پڑھانے کے لیے بنیادی چیزوں کا مطالعہ ضرور کریں۔ انھوں نے کہا کہ جس مضمون کے لیے استاد کی تقرری عمل میں آئی ہے، اس سے وہی مضمون پڑھوایا جائے تاکہ وہ اپنے مضمون کے ساتھ صحیح انصاف کر سکے۔ اردو اکادمی ڈائرکٹر پروفیسر قاضی افضال حسین نے تربیتی پروگرام کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ اس پندرہ روزہ پروگرام میں پچاس سے زائد اساتذہ حصہ لے رہے ہیں، جن کو اردو زبان و ادب کے تدریسی عمل کے لیے تربیت دی جائے گی۔

(روزنامہ "ہمارا سماج" دہلی)

[illegible]

● اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی جانب سے منعقدہ دس روزہ اورینٹیشن پروگرام کے الوداعی جلسے میں اکادمی کے ڈائریکٹر پروفیسر غضنفر علی نے پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اس پروگرام میں دہلی کے پرائمری اردو میڈیم اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں کے فروغ اور ان کی رہنمائی کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا گیا اور درس و تدریس سے متعلق ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا جن سے طریقۂ تعلیم کو بہتر بنایا جا سکے۔ اس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ تمام مضامین کے ماہرین مدعو کیے جائیں اور وہ اپنے تجربات و خیالات سے اساتذہ کی رہنمائی فرمائیں۔ جن مضامین پر خصوصی توجہ دی گئی ان میں رسم خط، انشا، املا، ترجمہ، قواعد، اصطلاحات، ماحولیات، سائنس، سماجیات، ریاضی اور ادب کی تدریس

کے طریقۂ کار، لسانی کھیل، اسباق کی منصوبہ بندی، انفارمیشن اینڈ ٹیکنالوجی وغیرہ اہم ہیں۔ پروفیسر غضنفر نے یقین دلایا کہ اگر انھیں اساتذہ اور انتظامیہ کا تعاون ملتا رہا تو وہ اکادمی کے کاموں کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ انھوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو زبان ترقی کرے تو ہمیں اس زبان سے جذباتی رشتہ رکھنا ہوگا اور اس جذباتی رشتے کو اپنے بچوں میں بھی بیدار کرنا ہوگا۔ اردو کو فروغ دینے کا اس سے بہتر اور کارگر طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

مہمانِ خصوصی پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے خطبے میں فرمایا کہ 1947 سے پہلے ہمارے ملک میں اردو سے بے بہرہ کوئی نہیں تھا۔ ہر آدمی کسی نہ کسی صورت میں اردو کو استعمال کرتا تھا اور اگر کوئی استعمال نہیں کرتا تھا تو وہ اردو کے تئیں مخاصمت کا جذبہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ یعنی اردو اس ملک میں دوسروں کے لیے غیر نہیں تھی اور دوسرے بھی اس سے بیگانہ نہیں تھے لیکن وقت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ حالات کے ایک اسٹروک سے اردو اپنے گھر میں بے گھر ہوگئی اور یہ تعصب رفتہ رفتہ پرورش پانے لگا کہ اردو ایک غیر ملکی زبان ہے۔ اردو کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی یہ ہوئی کہ کسی بھی سیاسی پارٹی نے اس بڑی زبان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس لیے اساتذہ پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اردو کی بقا کے لیے لگن سے کام کریں اور مسلسل جدو جہد کرتے رہیں۔ پروفیسر نارنگ نے یہ بھی فرمایا کہ جو سلاست، معنویت اور جمالیاتی خوبیاں اردو میں ہیں وہ کسی بھی زبان میں نہیں۔ اس زبان میں شارٹ ہینڈ کی ایسی صلاحیت ہے کہ یہ محض چند حروف کی مدد سے بہت سی مصوتی آوازوں کو لکھ لیتی ہے۔ اردو کا تحفظ ہندوستانیوں پر اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہندی ریاستوں میں ہندی زبان کو سب سے زیادہ جو طاقت ملتی ہے تو وہ اردو زبان سے ملتی ہے۔

نامور شاعر پروفیسر شہریار نے اپنے صدارتی خطبے میں غضنفر کی کوششوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو جیسی میٹھی، پیاری، شائستہ اور طاقتور زبان شاید ہی دنیا میں کوئی دوسری زبان ہو۔ ہمیں اپنی زبان پر پشیمان ہونے کی بجائے فخر کرنا چاہیے۔ ایسی بہترین زبان کا تحفظ ہر ہندوستانی پر فرض ہے۔

اس پروگرام میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماہرین زبان و تعلیم، دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ، جے۔ این۔ یو۔، این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی وغیرہ اداروں کے اساتذہ نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور زبان و ادب کی تدریس اور اردو میڈیم سے دیگر مضامین کی تدریس اور طریقۂ کار پر روشنی ڈالی اور اساتذہ کو نئے انداز سے سوچنے، اسباق کی منصوبہ بندی کرنے اور طریقۂ کار کو اپنانے کا راستہ دکھایا۔

(ڈاک سے)

[illegible]

● حیدرآباد۔ 23 جنوری، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اردو میں نصابی کتابوں کی تیاری کے لیے یونیورسٹی کے اساتذہ کو تمام تر سہولتیں فراہم کرے گی بالخصوص فنی کورسز کی کتابوں کا متعلقہ ماہرین سے ترجمہ کرواتے ہوئے ان کی عاجلانہ اشاعت یونیورسٹی کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان خیالات کا اظہار وائس چانسلر پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان نے یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانے میں سہ روزہ کتب میلے کے افتتاح کے موقع پر منعقدہ تقریب سے اپنے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ قبل ازیں مہمان خصوصی جناب رحیم الدین انصاری، صدر نشین آندھرا پردیش اردو اکادمی نے یونیورسٹی کی جانب سے نو تعمیر کردہ مرکزی کتب خانے میں سہ روزہ کتب میلے کا افتتاح کیا۔ جناب رحیم الدین انصاری نے اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو یونیورسٹی کی کارکردگی کو قابل ستائش اور قابل تقلید قرار دیا۔ ابتدا میں ڈاکٹر عباس خان، ڈپٹی لائبریرین وانچارج نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں اس میلے کے اغراض و مقاصد اور یونیورسٹی کی سرگرمیوں کا مختصر جائزہ پیش کیا۔ جناب عابد عبدالواسع، پبلک ریلیشن آفیسر نے تقریب کی نظامت کے فرائض انجام دیے جبکہ جناب محمد اظہر، ڈائرکٹر ہدی بک ڈسٹری بیوٹرس اینڈ پبلیشرس کے کلمات تشکر پر اس تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔

(ڈاک سے)

[illegible]

● نئی دہلی۔ 28 جنوری، آج کا دور مقابلوں کا دور ہے جس میں میرٹ کو بہت اہمیت حاصل ہے اس لیے مسلم نوجوان اس کے لیے خود کو تیار کر کے ترقی کی منزلیں سر کریں۔ ان خیالات کا اظہار آج انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام انجمن کمپیوٹر انفارمیشن سینٹر کے فارغ طلبہ و طالبات کے جلسۂ تقسیم انعامات و اسناد سے خطاب کرتے ہوئے دہلی کے وزیر خوراک و رسد اور صنعت ہارون یوسف نے کیا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے جب کہ نظامت ثاقب صدیقی نے کی۔ جلسے کے آغاز میں 2 منٹ کی خاموشی اختیار کر کے سابق صدر جمہوریۂ ہند آر۔ وینکٹ رمن کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ بعد ازاں ہارون یوسف نے سنٹر کے 08-2007 کے بیچ کے 53 کامیاب طلبہ و طالبات کو انعامات و اسناد تقسیم کیں۔

ہارون یوسف نے اپنی تقریر میں مزید کہا کہ اب اردو والوں کو مایوس ہونے یا احساس کمتری کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ نوجوانوں میں

خود اعتمادی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے قیام اور اس کے ارتقائی مراحل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس ادارے سے عظیم شخصیتیں وابستہ رہی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انجمن ترقی اردو میں اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے کمپیوٹر سینٹر کے علاوہ اور بھی کئی کورسز چل رہے ہیں جو بہت کامیاب ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین چندر بھان خیال نے کہا کہ ہارون یوسف سیاست کی دلدل میں ایک کنول کی طرح ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اب اردو میں روزگار سے مربوط کئی کورسز جاری ہیں جن سے اردو والے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ انھوں نے اردو سے وابستہ لوگوں کو ان کا فرض یاد دلاتے ہوئے کہا کہ ہمیں اپنے روزمرہ کے کاروبار میں اردو کے استعمال اور نفاذ کی طرف توجہ دینی چاہیے کیوں کہ اردو کے فروغ کے لیے صرف نعرے نہیں بلکہ عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ بہت ساری خامیوں کے باوجود اردو کی ترقی اور فروغ کے دروازے کھل رہے ہیں۔ آزادی کے بعد صرف دو تین یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن اس وقت 60-70 یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے نوجوان انفارمیشن ٹیکنالوجی سے لیس ہو رہے ہیں جو ان کے مستقبل کو بہتر بنانے میں بہت کارگر ثابت ہوگی۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا" دہلی)

ریاست جموں و کشمیر میں اردو ۔۔۔ ماضی، حال اور مستقبل پر سیمینار

● نئی دہلی ۔16 جنوری، اردو دنیا کی تیسری زبان ہے جو سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اس کا جنم ہندوستان میں ہوا اور جد و جہد آزادی میں اس نے نمایاں رول ادا کیا ہے، یہ بات جموں یونیورسٹی کے نومنتخب وائس چانسلر ورون ساہنی نے 'جموں و کشمیر میں اردو کا ماضی، حال اور مستقبل' پر منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہی۔ مذکورہ سیمینار کا انعقاد کشمیر یونیورسٹی اور جموں یونیورسٹی کے اردو شعبوں کے اشتراک اور این. سی. پی. یو. ایل کے تعاون سے کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں ورون ساہنی کے علاوہ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ریاض پنجابی، کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر حامدی کاشمیری نے بھی شرکت کی۔ اجلاس کے آرگنائزر پروفیسر شہاب عنایت ملک نے استقبالیہ اور پروفیسر نذیر ملک نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر تمکین نے ادا کیے۔ پروفیسر ریاض پنجابی نے جلد ایک کمیٹی تشکیل کرنے کا اعلان کیا جو ڈیڑھ، دو ماہ میں ریاست میں اردو کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لے کر رپورٹ کے مطابق سفارشات حکومت کو سونپے گی۔ پروفیسر حامدی کاشمیری نے جدید سائنسی علوم کے مدنظر اردو طریق تعلیم اور نصاب میں تبدیلیوں کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر نذیر ملک نے ریاست میں اردو کے مسائل پر اپنا کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر شہاب ملک نے کہا کہ اردو نے وادی، لداخ اور جموں کو اتحاد کے دھاگے سے باندھے رکھا ہے۔ اجلاس کے اختتام پر اراکین مجلس صدارت و مندوبین کا شکریہ ڈاکٹر محمد ریاض نے ادا کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد سیمینار کے پہلے اجلاس کے صدارت اراکین صدارت میں فاروق نازکی، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر خورشید حمرہ، پروفیسر مجید مضمر نے شرکت کی اور نظامت پروفیسر اسد اللہ نے کی۔ اجلاس میں ڈاکٹر مشتاق وانی (بھدروا)، ڈاکٹر بلراج بخشی، ڈاکٹر ایاز نازکی وغیرہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا" دہلی)

اردو کا مستقبل نہایت امید افزا

● حیدر آباد ۔23 جنوری، ہندوستان میں اردو زبان کا موجودہ مستقبل نہایت امید افزا ہے۔ اہل اردو کو اپنی زبان کے تعلق سے مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اردو کی تابنا کی کی سب سے بڑی مثال بن گئی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز شاعر پروفیسر شہریار نے اردو یونیورسٹی میں ایک ادبی نشست سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ شعبہ اردو نے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ممتاز شاعر کے اعزاز میں "ایک ملاقات" کا اہتمام یونیورسٹی کانفرنس ہال میں کیا تھا۔ پروفیسر خالد سعید صدر شعبۂ اردو نے صدارت کی۔ پروفیسر شہریار نے اپنی مختصر تقریر میں 1947 کے بعد کے پرآشوب دور کا حوالہ دیا اور کہا کہ اس وقت اردو کی موجودہ ترقی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ پروفیسر شہریار نے اردو کو شہری زبان قرار دیتے ہوئے نشاندہی کی کہ Urbanizntion کے رجحان میں اضافے کے ساتھ اردو کی مقبولیت میں بھی دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ پروفیسر شہریار نے یونیورسٹی کی تیز رفتار ترقی پر وائس چانسلر پروفیسر اے. ایم. پٹھان اور پرووائس چانسلر پروفیسر کے. آر. اقبال احمد کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے بانی وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراجپوری کی بھی ستائش کی۔ پروفیسر شہریار نے ادبی نشست میں اپنی پانچ غزلیں اور دو نظمیں پیش کیں۔ انھوں نے اس موقع پر حاضرین کے سوالات کے تفصیلی اور تشفی بخش جواب دیے۔ پروفیسر شہریار نے بتایا کہ مرزا غالب ان کے پسندیدہ شاعر رہے ہیں۔ پروفیسر خالد سعید نے شہریار پر تحریر کردہ اپنے ایک مضمون کے اقتباسات پیش کیے۔ قبل ازیں ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس، ریڈر شعبہ

اردو نے خیر مقدم کیا اور مہمان خصوصی کا تعارف کروایا۔ پروفیسر شہریار پر انسٹرکشنل میڈیا سنٹر کی تیار کردہ ڈاکیومنٹری کی جھلک بھی پیش کی گئی۔

(روزنامہ "منصف"، حیدرآباد)

[illegible]

● پٹنہ۔30 دسمبر، اردو ایجوکیشنل کونسل کے سکریٹری شارب مجید نے جھارکھنڈ قانون ساز اسمبلی میں 19 دسمبر 2008 سے اردو زبان میں سرمائی اجلاس سے متعلق فہرست امور شروع کیے جانے پر اسپیکر عالمگیر عالم کی ستائش کرتے ہوئے انھیں دلی مبارک باد پیش کی اور کہا کہ اردو شعبے میں باصلاحیت لوگوں کی بحالی کے بعد جھارکھنڈ قانون ساز اسمبلی میں اردو کا کام باضابطہ طور پر شروع ہو جائے گا، جھارکھنڈ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں دوسری ریاست ہے جہاں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی قانون ساز اسمبلی اجلاس سے متعلق کام کی شروعات کی گئی ہے۔ وہاں کے تمام افسران کے ناموں کی تختیاں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں لکھے جانے کی ہدایت دی گئی ہے۔ اب وہاں کے اردو شعبے کے افسران و ملازمین کی ذمہ داری ہوگی کہ ترویج کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیں۔

(روزنامہ "قومی تنظیم" پٹنہ)

اردو کو اسکولوں میں لازمی زبان بنانے کا مطالبہ

● جمشید پور۔7 فروری، اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اور ہماری مشترکہ تہذیب کی شاندار مظہر ہے۔ اس کا خمیر ہندو اور مسلمانوں کے صدیوں کے میل جول اور باہمی تعلقات سے تیار ہوا ہے اور اس کی آبیاری میں جہاں میر و غالب اقبال اور حالی نے عرق ریزی کی ہے۔ وہیں راجہ رام موہن موزوں، لالہ خوشونت رائے، شاداب، برج نارائن چکبست، پریم چند، کرشن چند اور دوسرے، بہت سے مشہور قلمکاروں نے اپنے خون سے اس کی آبیاری کی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی جنم بھومی میں بھید بھاؤ اور سوتیلے پن کا سلوک افسوسناک ہے۔ مذکورہ باتیں جھارکھنڈ جرنلسٹ کوآرڈینیشن کمیٹی کے تحت اردو کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے راشٹریہ سہارا کے نمائندہ ندیم احسن نے کہیں۔ اس کانفرنس کا موضوع تھا" ہماری اردو: ہم اس سے دور کیوں؟" مسٹر ندیم احسن نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اسکولوں میں اسے اختیاری زبان کے بجائے لازمی زبان کا درجہ دیا جائے اور اسے روزی روٹی سے جوڑا جائے۔ صحافی شاکر عظیم آبادی نے کہا کہ آبادی کا ایک بڑا حصہ تعلیم کے میدان میں پیچھے ہے۔ جسے تعلیم سے جوڑنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ صحافی افسار احمد نے کہا کہ اردو کی ترقی اس وقت ہو پائے گی جب ہم اپنے بچوں میں اردو کا شغف پیدا کریں گے اور اردو اسکولوں میں تعلیم کی بہتری کے لیے دھیان دیں گے۔ صحافی ارشد نے کہا کہ اردو والے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے انگریزی اسکولوں کی طرف دیکھنا بند کریں اور اردو اسکولوں کے تعلیمی نظام کو چست درست کرنے پر توجہ دیں۔ ٹاٹا کارپوریٹ کے چیف مسٹر نجیب چودھری نے قومی ایکتا شمع روشن کر کے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو قومی یکجہتی کی پہچان ہے۔ اسے کسی مذہب کے تناظر میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ ایک بہت ہی میٹھی اور پیاری زبان ہے جس میں شگفتگی بھی ہے اور شگفتگی بھی اور شائستگی بھی۔ انھوں نے یقین دلایا کہ اردو کے فروغ کے لیے وہ جھارکھنڈ جرنلسٹ کوآرڈینیشن کمیٹی کو اپنا تعاون دینے میں کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اس موقع پر پرنسپل صفدر رضی نے کہا کہ اردو داں طبقے نے بھی اردو کو زخم لگائے ہیں۔ اگر اردو داں طبقہ اردو کو پوری طرح اپنالے تو اردو کو اس کا جائز مقام ملنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ اس موقع پر پرنسپل ڈاکٹر ذکریا نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ انگریزی زبان کو روزی روٹی سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اردو زبان کو بھی روزی روٹی سے جوڑا جائے۔ تبھی اس کی ترقی ممکن ہے۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا" دہلی)

نئی نسل کی اردو زبان سے ناواقفیت افسوسناک

● مرادآباد۔8 فروری، ضلع مرادآباد علم وادب اور اردو زبان کا گہوارہ رہا ہے اور یہاں وہ صاحب علم پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی اردو زبان کا پرچم لہرایا مگر آج صورتحال یہ ہے کہ پورے ملک کی طرح ضلع مرادآباد میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد مسلسل کم ہوتی چلی جا رہی ہے اور نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوان بھی اپنی مادری زبان سے نا آشنا ہیں۔ یہ صورتحال انتہائی افسوسناک ہے اور اس کو بدلنے کے لیے مجلہ محبان اردو کو آگے آنا ہوگا۔ یہ الفاظ آج یہاں اردو کی ابھرتی ہوئی افسانہ نگار شبنم راہی کی رہائش گاہ پر محبان اردو کی ایک میٹنگ میں جنت نشاں اکیڈمی کے ڈائرکٹر ماسٹر عتیق احمد نے میٹنگ کے صدارتی خطبے میں ادا کیے۔ میٹنگ میں شہر کی سرگرم ملی اور ادبی تنظیموں کے نمائندے شریک تھے۔ اس موقع پر کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے صوبائی کنوینر مختار صدیقی نے شمالی ہند میں اردو کی ابتر صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ملک کے جنوبی علاقوں آندھرا پردیش، کرناٹک اور مہاراشٹر میں آج بھی اردو زبان کی صورت حال بہت اچھی ہے، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا ہے کہ اردو زبان میں ہماری تہذیب و تمدن اور تمام تر مذہبی سرمایہ محفوظ ہے۔ الحاج عبدالحمید شمسی نے

بھی زبان کی موجودہ صورت حال پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے نئی نسل کو زبان سے واقف کرانے کے لیے سرگرم ہونے کا مشورہ دیا۔ ناصر منصوری نے کہا کہ اردو زبان کے لیے کام کرنے والے لوگ اگر متحد ہو کر کام کریں تو اس کے نتائج لازمی طور پر حوصلہ افزا ہوں گے۔ ڈاکٹر فیضی نے کہا کہ شہر میں آج بھی اردو زبان سے محبت کرنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے اور ہمیں ان تمام اصحاب کو اپنے ساتھ جوڑ کر زبان کے فروغ کے لیے سرگرم ہونے میں بڑی تقویت حاصل ہو سکتی ہے۔ گوکل داس ڈگری کالج میں اردو کی لکچرار ڈاکٹر زیبا ناز نے مشورہ دیا کہ تعلیمی کمیٹی کی مراد آباد شاخ کے قیام کے لیے آئندہ ہونے والی میٹنگ میں تمام محبان اردو کو مدعو کیا جائے گا۔ آئندہ میٹنگ 15 فروری کو تنظیم کے صوبائی آفس ڈپٹی گنج میں منعقد کیے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

سیتامڑھی میں اردو کانفرنس

●سیتامڑھی۔ 19 جنوری، سیتامڑھی شہر کے مہسول چوک وسیع میدان میں اردو کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ جناب احمد مظفر کی زیر صدارت ضلع کے تمام شہروں اور دیہی علاقوں سے آئے سیکڑوں محبان اردو کی موجودگی میں پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے مشتاق راہی نے کہا کہ ضلع میں اردو کی لسانی، تہذیبی بقا ترقی وترویج کے لیے اتنی بڑی تعداد میں اردو داں افراد کی موجودگی واقعی اردو زبان کے لیے خوش آئند ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی خدمت اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ہم خود آگے بڑھ کر اس کی پہل نہیں کریں گے۔ اردو اسکولوں میں اپنے بچوں کا داخلہ، شادی بیاہ کے دعوت نامے اردو زبان میں چھاپنا اور اردو اخبارات ورسائل خرید کر پڑھنے کی عادت ہمیں ڈالنی ہوگی۔ ڈاکٹر مطیع الرحمٰن نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو پڑھیں، اردو بولیں اور اردو لکھیں۔ حافظ انصار احمد دھرم پوری نے اردو اخبارات خرید کر پڑھنے پر زور دیا۔ ڈاکٹر محمد شرف الدین لکچرر گوئنکا کالج سیتامڑھی نے کالج کے طلبہ اور نئی نسل کو اردو کی طرف راغب کرنے پر زور دیا۔ مسعود شمس نے ضلع میں پہلی بار ادبی سرگرمی شروع ہونے پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ماہانہ نشست منعقد کرا کے اسے حقیقی شکل دی جائے گی۔ اشرف مولانگری نے کانفرنس کی کامیابی کے لیے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ بڑی تعداد میں لوگوں کی موجودگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ لوگ اپنی زبان سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ ایم. ایف. حسن نے بھی اردو زبان کی ترقی کے لیے ضلع کے لوگوں کی شمولیت پر مسرت کا اظہار کیا۔ ابواللیث عرف کالو بابو نے کم مدت میں لوگوں کی شرکت اور ان کی ادب سے دلچسپی پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تمام لوگوں کی شرکت سے اس مشن کو پورا کیا جائے گا۔ انجمن ترقی اردو سیتامڑھی کے سکریٹری اور صحافی طالب حسین آزاد نے کہا کہ اردو کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم کا نظم اردو میں نہیں کرتے۔ کانفرنس میں ایم. ایف. حسن، ابواللیث عرف کالو بابو، محمد شرف الدین، ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن، اشرف مولانگری، صابر حسین خان، تنویر مولانگری، شفیع عاجز راجو، ماسٹر قمر الہدیٰ صادق حسین، آفاق احمد پوپری ودیگر افراد شامل تھے۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

کلیم الدین احمد کا پچیسواں یوم وفات

●پٹنہ۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کے پچیسویں یوم وفات پر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر کلیدی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر خورشید احمد صدر شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کلیم الدین احمد کے نئے سرے سے مطالعے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ادب کے آفاقی معیاروں کی تلاش کلیم الدین احمد اور ان کے بعض دوسرے معاصرین کا نصب العین تھا۔ مابعد جدیدیت کے اس دور میں جب ادب کو اپنی ثقافت اور کلچر کا پروردہ تسلیم کرنے پر زور دیا جا رہا ہے، اس طرح کے آفاقی معیاروں کی تلاش دشوار بھی ہے اور بے کار بھی۔ اس کے باوجود کلیم الدین احمد کے یہاں بہت کچھ ایسا ہے جو انھیں اردو تنقید کی دنیا میں تادیر زندہ رکھے گا۔ انھوں نے کلیم الدین احمد کی عملی تنقید اور داستان گوئی کے حوالے سے لکھی گئی ان کی تحریروں کا حوالہ دیا اور ان کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر خورشید احمد نے یہ بھی کہا کہ کلیم الدین کی شعوری طور پر یہ کوشش رہی ہے کہ مقبول اصناف اور شخصیات پر اعتراضات کیے جائیں جب کہ بعض غیر مقبول اصناف اور شخصیات کی خوبیاں سامنے لائی جائیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اقبال، انیس، نظیر، حالی اور صنف غزل سے متعلق کلیم الدین احمد کی تحریروں کی طرف توجہ دلائی۔

اس سے قبل مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی پروفیسر اعجاز علی ارشد نے واضح کیا کہ کلیم الدین احمد اپنے بعض متنازعہ نظریات کے باوجود آج بھی اردو کی اہم ترین کتابوں یا اہم ادبی مراکز میں موضوع گفتگو رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی فن کار یا نقاد کی اس کی زندگی میں مقبولیت مختلف اسباب کی مرہون منت ہو سکتی ہے مگر اس کے ادبی مقام کا صحیح تعین اس کی وفات کی چند دہائیوں کے بعد ہی ہو پاتا ہے۔ اس اعتبار سے کلیم الدین احمد کے نئے مطالعے کا کام اب شروع ہوا ہے، جبکہ ان کی وفات کو پچیس برس گزر چکے ہیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر امتیاز احمد ڈائرکٹر خدا بخش

لائبریری پٹنہ نے کلیم الدین احمد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور خاص طور پر ان کی انگریزی کتاب ''Idols'' کے حوالے سے واضح کیا کہ وہ اگرچہ Practicing Muslim نہیں تھے اور انھیں نماز روزہ وغیرہ سے زیادہ سروکار نہ تھا لیکن ملت کے مسائل سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ اس سلسلے میں ایک خاص نقطۂ نظر بھی رکھتے تھے اور ان کا دل خوف خدا سے معمور تھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اگلے سال خدا بخش لائبریری کے زیر اہتمام کلیم الدین احمد کی صد سالہ تقریبات وسیع پیمانے پر منعقد کی جائیں گی۔ صدر جلسہ پروفیسر اسلم آزاد نے کلیم الدین احمد سے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ دائرۂ ادب کی اکثر نشستوں میں انھیں کلیم صاحب کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور وہ ادب کے علاوہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر جن میں سیاست بھی شامل ہے، پر لطف گفتگو کرتے تھے، اگرچہ ایسا اتفاق کم ہوتا تھا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد اسرائیل رضا نے کہا کہ میں انھیں اردو تنقید کا معمار اول تسلیم کرتا ہوں۔ ڈاکٹر ابوبکر رضوی کا خیال تھا کہ کلیم الدین احمد پر جس طرح کا کام ہونا چاہیے تھا اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ پروفیسر یونس مشہدی نے کلیم الدین احمد صد سالہ تقریبات کے انعقاد کو فال نیک قرار دیتے ہوئے اس سے اہم توقعات کا اظہار کیا۔ شعبۂ اردو کے طلبہ و طالبات میں سے سید محمد امتیاز، شفقت نوری، عبد الباسط، نشاط آفریں، عریشہ تسنیم اور صائمہ تزئین نے بھی کلیم الدین احمد کی شخصیت اور خدمات پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر محمد عظیم اللہ نے مہمانان ذی وقار اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(ڈاک سے)

مختصرات

● نئی دہلی۔ 09 فروری، دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں جامعہ ازہر (مصر) کے پروفیسر احمد قاضی نے عربی زبان کی اہمیت اور مصر میں افسانہ نگاری پر ایک جامع لیکچر دیا۔ انھوں نے کہا کہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور وہی ادب مقبول ہوتا ہے جو سماجی معاشرتی زندگی کو اپنے اندر سمو لے۔ اس تناظر میں انھوں نے جدید ادبا میں سلیمان طاہر، جمال غیطانی، سکینہ فواد وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان لوگوں نے اپنے افسانوں میں سماجی مشکلات کا اہتمام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ انھوں نے طلبہ کو عربی زبان بولنے کی طرف رغبت دلاتے ہوئے کہا کہ زبان سیکھنے کے لیے خاص ماحول کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مصر میں رائج مختلف سماجی اقدار اور روایات کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ بہت سی باتیں تہذیب و ثقافت کے محل وقوع بدل جانے سے بدل جاتی ہیں۔ کچھ باتیں مصر میں مقبول عام ہیں، وہی باتیں ہندوستان میں معیوب تصور کی جاتی ہیں۔ اس لیے مقامی و سماجی ماحول کا بھی حتی الامکان خیال رکھنا چاہیے۔ انھوں نے شعبۂ عربی کے اساتذہ اور طلبہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مجھے شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی میں وہی ماحول ملتا ہے، جو ہمارے یہاں مصر میں پایا جاتا ہے۔ آخر میں پروفیسر محمد نعمان خان سابق صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ (روزنامہ ''راشٹریہ سہارا''، دہلی)

● میوات۔ 16 جنوری، ''اردو اخبارات کو سرکاری دفاتر میں لگایا جائے اور ہریانہ میں اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے اسکولوں میں اردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔'' ان خیالات کا اظہار مولانا زبیر احمد حسینی نے ہمارا سماج سے خصوصی ملاقات میں کیا۔ انھوں نے ہریانہ سرکار سے مانگ کی کہ ہریانہ میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے اسکولوں میں اردو کے اساتذہ کا تقرر کیا جائے اور اردو اخبارات کو سرکاری دفاتر میں لگایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہریانہ کے ضلع میوات میں اردو کی ترقی و ترویج کی سخت ضرورت ہے اور اسکولوں میں طلبہ کے لیے اردو اساتذہ کا تقرر کیا جانا بہت ضروری ہے تاکہ میوات میں اردو کی تعلیم کا فروغ ہو۔ انھوں نے کہا کہ وعدوں اور دعوؤں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ کام کی ضرورت ہے۔ مولانا زبیر احمد حسینی نے کہا کہ اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے سے حقیقی معنی میں ترقی ہوگی اور اردو داں طبقہ روزگار سے جڑ سکے گا۔ انھوں نے عوام سے بھی اپیل کی کہ وہ خود بھی اردو لٹریچر کو پڑھیں اور اپنے بچوں کو بھی اردو کی تعلیم دلائیں۔

(روزنامہ ''ہمارا سماج'' دہلی)

● بھوپال۔ 27 جنوری، مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کے تعاون سے 27 جنوری، 2009 کو دو بجے دن ملا رموزی سنسکرتی بھون میں اردو زبان و ادب پر سیمینار منعقد کیا گیا۔ سیمینار کی ابتدا میں اکادمی کی سکریٹری نصرت مہدی نے پروگرام کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ سیمینار کے پریسڈیم میں ڈاکٹر بشیر بدر، چیئرمین اور جناب مرزا جعفر بیگ، وائس چیئرمین، مدھیہ پردیش اردو اکادمی تھے۔ سیمینار میں ڈاکٹر محمد شفیع نے ''اردو زبان کو درپیش مسائل (بحیثیت زبان)'' ڈاکٹر خالد محمود، نے ''اردو کی بقا کا مسئلہ''، جناب عزیز اندوری نے ''اردو صحافت میں زبان کا بدلتا منظرنامہ'' جناب ملک زادہ منظور احمد نے ''مشاعروں کی صورت حال مقبولیت اور اس کے اسباب''، جناب انور جلال پوری، نے ''ناظم مشاعرہ کا تنقیدی احتساب'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے بھوپال کے محمد احسان نے بھی مقالہ پیش کیا۔

(ڈاک سے)

● چاند پور، ۹ فروری، عالمی شہرت یافتہ اردو افسانہ نگار اور گیان پیٹھ ایوارڈ سے سرفراز بجنور ضلع کے قصبہ نہٹور کی باشندہ مرحومہ ڈاکٹر قرۃ العین حیدر کی یاد میں رحمانیہ گرلز انٹر کالج چاند پور میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ منڈیلہ دکاس سنستھان کے زیر اہتمام ہونے والے مذکورہ سیمینار کا افتتاح دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی نے کیا۔ سیمینار میں نئی دہلی سے وسیم راشد، ڈاکٹر عبدالحق، روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے افشاں ملک، قدیر ارم، ڈاکٹر افسر علی، شبنم راہی، رضوان انصاری، شکیل جمالی، سبھاش جاداوغیرہ نے قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات پر مقالات پیش کیے اور ان کو اردو زبان ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستانی زبانوں کی عظیم ادیب اور گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار بتایا۔ ڈاکٹر خالد علوی نے کہا کہ قرۃ العین حیدر کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا پھر وہ ناول نگاری کی جانب آئیں اور انھوں نے ''آگ کا دریا'' جیسا لاجواب ناول لکھا، جسے اردو کا سب سے بڑا ناول کہا جاتا ہے۔ سیمینار کی صدارت ڈاکٹر لئیق نادر نے کی اور نظامت کے فرائض الیاس انجم نے انجام دیے۔ اس موقع پر شہر کی مشہور شخصیات موجود تھیں۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

● ہندستانی پرچار سبھا کے زیر اہتمام ' اردو میں سائنس اور ٹیکنالوجی'' کے موضوع پر 6 جنوری، 2009 کو تقریر کا انعقاد کیا گیا۔ ''سائنس کی دنیا'' نئی دہلی کے سابق مدیر جناب محمد خلیل نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب سبھاش سمپت، ٹرسٹی و اعزازی سکریٹری نے اس جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔

جناب محمد خلیل نے سائنسی ادب کی پوری تاریخ سامعین کے سامنے رکھی اور بتایا کہ 1863 میں سرسید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی نے مجلہ تہذیب الاخلاق جاری کیا بعد ازاں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ و دارالاشاعت نے 1917 تا 1947 اس کام کو آگے بڑھایا۔ مولوی عبدالحق نے پہلا سائنسی رسالہ ''سائنس'' 1927 میں حیدرآباد سے جاری کیا۔ اردو میں پہلی سائنسی کتاب 1789 میں شائع شدہ ''بحر حکمت'' ہے جو پارکنسن کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ 1975 میں پروفیسر اے۔ رحمٰن کی نگرانی میں مقبول سائنس کا پہلا سہ ماہی رسالہ ' سائنس کی دنیا' شائع ہوا۔ جو آج تک جاری ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے انسانی زندگی میں فوائد کا ذکر کرتے ہوئے صدر جلسہ جناب سبھاش سمپت نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا ہم نے بھی جلسوں میں دیا روشن کرنے کی رسم کو جدید طرز پر بٹن دبا کر ایک لمحے میں پورا کر دیا ہے اور اس طرح سائنس کا فائدہ وقت بچانے میں کر لیا ہے۔ انھوں نے جناب محمد خلیل کے مقالے کو سراہتے ہوئے انھیں مبارک باد دی۔

ابتدا میں ریسرچ آفیسر (اردو) محمد حسین پرکار نے مہمان خصوصی اور صدر جلسہ کا تعارف پیش کیا۔ آخر میں سبھا کی اعزازی ریسرچ ڈائرکٹر سشیلا گپتا نے رسم شکریہ ادا کی۔ قومی گیت کے ساتھ پروگرام کا اختتام ہوا۔

(ڈاک سے)

● اٹاوہ نمائش کمیٹی کے زیر اہتمام گذشتہ روز پنڈال میں منعقد کانشی رام یادگاری اردو کانفرنس میں ضلع کی ادبی، علمی، دینی، سیاسی، ساجی، ثقافتی شخصیات سمیت 251 افراد کو اعزازیہ دے کر اتر پردیش مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے چیئرمین حاجی رضوان الحق ایڈوکیٹ اور اشیاخوردنی کارپوریشن کے صدر گوری شنکر ایڈوکیٹ نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ قاضی شہر کانپور مولانا عالم رضا نوری کی صدارت میں منعقد اس کانفرنس میں اردو کی تہذیبی، ساجی اور فرقہ وارانہ خیر سگالی کے کردار پر مقررین نے اظہار خیال کیا۔ مولانا عالم رضا نوری نے کہا کہ اردو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ یہیں پلی اور بڑھی، اس کی نشو و نما سبھی مراحل اسی بھارت کی دھرتی پر پورے ہوئے۔ اس کو پالنے پوسنے اور ترقی دینے میں نہ صرف مسلمانوں نے اپنا خون جگر بہایا بلکہ ہندو اور دیگر اقوام نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ حاجی رضوان الحق ایڈوکیٹ نے کہا کہ اتر پردیش میں اردو کی تعلیم کے لیے ریاستی حکومت سنجیدہ ہے۔ آج ضرورت ہے کہ اردو والے اپنی زبان اور اپنی تہذیب کے تحفظ کے لیے از خود پہل کریں اور حکومت کے ذریعہ کیے جا رہے فلاحی فیصلوں سے استفادہ کریں۔ شری گوری شنکر ایڈوکیٹ نے کہا کہ ہمارا ملک مختلف مذاہب، زبانوں، تہذیبوں، اور ذاتوں کا ملک ہے، یہ کثیر ثقافتی اور کثیر تہذیبی روایت ہماری یکجہتی کی روایت ہے۔ کچھ عناصر ملک کو مذہب، ذات اور علاقوں کی بنیاد پر توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ نہ تو ملک کے دوست ہیں اور نہ ہی ان کو وطن سے کوئی محبت ہے۔ سابق وزیر حکومت اتر پردیش جناب بشیر الدین نے کہا کہ اردو زبان دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے، اس کی کشش اور مٹھاس ان کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے جو اردو سے ناواقف ہیں۔

کانفرنس کے کنوینر خادم عباس نے کہا کہ اردو کے ادیب، شاعر اور صحافی ملک دشمن طاقتوں سے اسی طرح برسرپیکار ہوں جس طرح جنگ آزادی میں اردو قلمکاروں نے انگریزی حکمرانوں کے دانت کھٹے کیے تھے۔ سابق ممبر اسمبلی رویندر سنگھ چوہان، مجیب الرحمٰن قریشی، محترمہ شبانہ قریشی

اور جناب اے. کے. سنگھ نے بھی اظہار خیال کیا۔

(ڈاک سے)

● نئی دہلی۔ 29 جنوری، تیرھویں مجلسِ فروغ اردو ادب ایوارڈ کے لیے اردو کی صفِ اول کی نقاد اور محقق پروفیسر سیدہ جعفر کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی تمغے اور سپاس نامے پر مشتمل ہے جو ہر سال دوحہ قطر کی ایک شاندار تقریب میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے یہ ایوارڈ ہندوستان میں آل احمد سرور، قرۃ العین حیدر، کالی داس گپتا رضا، جوگندر پال، جیلانی بانو، سریندر پرکاش، پروفیسر گوپی چند نارنگ، صلاح الدین پرویز، نثار احمد فاروقی، قاضی عبدالستار، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر وارث علوی اور پاکستان میں احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، انتظار حسین، مختار مسعود، بانو قدسیہ، محمد خالد اختر، شوکت صدیقی، مستنصر حسین تارڑ، عبد اللہ حسین، ہاجرہ مسرور، اسد محمد خاں اور فشا یاد کو پیش کیا جا چکا ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر کے نام کا اعلان پینل آف ججز نے کیا جس کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ اور اراکین جیوری پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر شافع قدوائی اور چندر بھان خیال تھے جب کہ جناب محمد عتیق، چیئرمین بورڈ آف ٹرسٹیز، مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر، کی اطلاع کے بموجب اس سال پاکستان میں یہ ایوارڈ ممتاز نقاد اور محقق پروفیسر جمیل جالبی کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ پاکستان میں جیوری کے چیئرمین جناب مشتاق احمد یوسفی تھے۔ پروفیسر سیدہ جعفر عثمانیہ یونیورسٹی اور سنٹرل یونیورسٹی حیدر آباد میں اردو کی پروفیسر اور صدر شعبہ رہی ہیں اور چالیس برس سے زائد کی خدمات کے بعد 1994 میں ریٹائر ہوئی ہیں۔ وہ تقریباً تیس (30) کتابوں کی مصنف و مؤلف ہیں۔ ان کا خصوصی میدان دکن کا اردو ادب ہے۔ وہ کام جسے بابائے اردو مولوی عبد الحق اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے شروع کیا تھا، پروفیسر سیدہ جعفر نے اسے پوری تندہی اور دلسوزی سے جاری رکھا ہے اور دو درجن سے زائد کتابیں شائع کیں۔ اس کے بعد انھوں نے "تاریخ ادب اردو" کی چار ضخیم جلدیں (عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک) مکمل کیں۔ ماسٹر رام چندر اور اردو انشائیے پر بھی ان کے کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان کی متعدد کتابوں کے تراجم انگریزی، عربی، ہندی، مراٹھی اور تیلگو میں شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے پوری زندگی اردو ادب کی خدمت کے لیے وقف کردی ہے۔

(روزنامہ "ہندوستان ایکسپریس" دہلی)

● حیدر آباد۔ 29 دسمبر، اردو اکادمی آندھرا پردیش نے تعلیمی خدمات کے لیے اپنا سب سے بڑا ایوارڈ ماہر تعلیم اور جامعہ ہمدرد، نئی دہلی کے چانسلر جناب سید حامد کو پیش کیا ہے۔ ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے منسوب ایک لاکھ 25 ہزار روپے پر مشتمل اس ایوارڈ کو قبول کرنے کے بعد جناب سید حامد نے تالیوں کی گونج میں اعلان کیا کہ وہ ایوارڈ کی یہ رقم دارالمصنفین اعظم گڑھ کو ہدیہ کر رہے ہیں۔ مدینہ ایجوکیشن سنٹر حیدر آباد کے نہرو آڈیٹوریم میں منعقدہ تقریب میں ریاستی وزیر برائے توانائی اور اقلیتی امور جناب محمد علی شبیر نے سید حامد صاحب کی خدمت میں ایوارڈ پیش کرتے ہوئے اسے اردو اکادمی کے لیے باعث فخر قرار دیا۔ اس موقعے پر اردو اکادمی کے صدر محمد رحیم الدین انصاری نے سید حامد صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے تعلیمی میدان میں ان کی ہمہ جہت خدمات کا اعتراف کیا۔

جناب سید حامد نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو اکادمیاں اردو سکھانے کے کام کو اولیت دیں کیوں کہ ادب زبان کے فروغ کے ساتھ ہی پنپ سکتا ہے انھوں نے کہا کہ اردو زبان کا سب سے اہم وصف شیرینی نہیں ہے بلکہ اس کی توانائی اور اظہار کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ سید حامد نے مزید کہا کہ علاقائی زبانوں نے ہر آن بدلتی ہوئی صورتحال سے جس طرح زور آزمائی کی ہے' اردو نے وہ روش اختیار نہیں کی کیوں کہ اردو نے کبھی ریاستی حد بندیوں کو قبول نہیں کیا اور اس کا دائرۂ کار ہمیشہ پورے ملک پر محیط رہا۔

ریاستی وزیر جناب محمد علی شبیر نے اس موقعے پر حکومت آندھرا پردیش کی طرف سے اردو کے فروغ کے لیے کی جارہی کوششوں کی تفصیلات بیان کیں۔ انھوں نے بتایا کہ اردو میڈیم کے 3 لاکھ، 86 ہزار طلبہ کو 22 کروڑ روپے کے وظائف تقسیم کیے گئے ہیں اور تکنیکی شعبوں میں زیر تعلیم 16 ہزار سے زیادہ اقلیتی طلبہ کی فیس حکومت ادا کر رہی ہے۔

(ڈاک سے)

● آگرہ۔ 8 فروری، آزادی کے بعد ہندوستانی تہذیب و ادب کی نمائندگی جن مشاہیر نے کی ان میں میکش اکبرآبادی کا نام منفرد ہے۔ وہ مشرقیات کے محافظ اور علم و ادب کے پاسدار تھے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر شمیم حنفی نے کیا۔ وہ یہاں میکش ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد سیمینار میں اظہار خیال کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شمیم حنفی نے کہا کہ میکش کے فکر و فلسفہ پر بھی تحقیقی کام ابھی باقی ہے۔ قبل ازیں بزم میکش کے سرپرست سید اجمل علی شاہ اور صدر حکیم سید مرغوب الزماں نے انھیں سال 09-2008 کا میکش ایوارڈ پیش کیا۔ اسرار اکبرآبادی نے سپاس نامہ پڑھ کر سنایا۔ ڈاکٹر نسرین

بیگم جنرل سکریٹری نے بزم کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ قبل ازیں یہ ایوارڈ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، شہریار، ہربھجن سنگھ تھاپر، کالی داس گپتا رضا وغیرہ کو پیش کیا جاچکا ہے۔ اس کے بعد میکش اکبرآبادی کے فن اور شخصیت پر سیمینار ہوا جس میں ڈاکٹر محمد علی جوہر، ڈاکٹر خالد سیف اللہ، ڈاکٹر نسرین بیگم اور بینظمی دیوی گرلز کالج کی طالبہ ارم سلیم نے مقالات پیش کیے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے میکش اکبرآبادی کے تصوف، علامہ اقبال کے فلسفہ اور عربی و فارسی پس منظر میں ہندوستان میں تصوف کی شاعری و تحقیقات پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے زور دیا کہ بزم میکش کو علامہ میکش اکبرآبادی کی تخلیقات اور ان کے افکار کی ازسرنو اشاعت کرنا چاہیے۔ نظامت ڈاکٹر نسرین بیگم نے کی۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

● نئی دہلی۔ 31 جنوری، کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کی مجلس عاملہ کی جانب سے آج آندھرا پردیش بھون، نئی دہلی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین چندر بھان خیال کو استقبالیہ دیا گیا۔ اس موقعے پر تنظیم کے بانی چیئرمین محمد جلیل پاشا اور ریاستی کنوینر مختار صدیقی نے ان کی گلپوشی کی۔ جلیل پاشا نے چندر بھان خیال کی اردو زبان کے حوالے سے گراں قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ ان کی سرپرستی میں کونسل اردو زبان کی ترقی کے لیے نمایاں کام کرے گی۔ مختار صدیقی نے کہا کہ بلاشبہ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ارجن سنگھ نے قومی کونسل کے وائس چیئرمین کے عہدے پر چندر بھان خیال کو نامزد کر کے اس ادارے کو ایک فعّال اور حقیقی محبِ اردو دیا ہے۔ استقبالیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے چندر بھان خیال نے محمد جلیل پاشا کی اردو زبان کے لیے خدمات کی ستائش کرتے ہوئے ان کے مشن میں اپنے بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ وہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ایک فعال ادارہ بنانے کی حتی المقدور کوشش کریں گے اور اس کی توسیع کے لیے جلد ہی ملک کی مختلف ریاستوں کا دورہ کریں گے۔

(روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

● پٹنہ۔ 25 جنوری 2009، خدا بخش لائبریری میں 25 جنوری کی شام نامور شاعر عبدالاحد ساز کے اعزاز میں پروگرام کا انعقاد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر شکیل احمد، اسٹیٹ انفارمیشن کمشنر بہار نے فرمائی۔ پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے مہمان شاعر اور سامعین مجلس کا والہانہ استقبال کرتے ہوئے عبدالاحد ساز کی شخصیت سے لوگوں کو متعارف کرایا اور یہ کہا کہ اردو ادب میں عبدالاحد ساز ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔

جناب عبدالاحد ساز نے اس تقریب میں کچھ اپنے متعلق کچھ اپنی شاعری کے متعلق گفتگو کی اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میرا تعلق ممبئی کی میمن برادری سے ہے۔ میری پیدائش 1950 کی ہے۔ 1970 کے دہے میں شاعری کے افق پر جو شعرا ابھرے ان میں میرا شمار ہوتا ہے۔ میں نے اسکول کے زمانے (1946) سے ہی شاعری کا آغاز کیا۔ اسکول میں مجھے جالب مظاہری سہرامی سے ادبی تربیت حاصل ہوئی۔ کلام کی اشاعت کا سلسلہ 1975 سے شروع ہوا۔ میں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزلیں، نظمیں، رباعیات، قطعات، حمد و نعت، گیت، دوہے ان سب اصناف میں شاعری میں نے کی ہے۔ ملک و بیرون ملک کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتا رہا ہوں۔ بزرگوں میں سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، کالیداس گپتا رضا سے مجھے نیاز حاصل رہا۔ ممبئی میں اردو کا ماحول بہت اچھا ہے لیکن فاصلے اتنے زیادہ ہیں کہ 85-1980 میں جو ادبی جماؤ تھا وہ اب بکھر سا گیا ہے۔ میرے دو مجموعۂ کلام ''خموشی بول اٹھی ہے'' اور ''سرگوشیاں زمانوں کی'' شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ مہاراشٹر، ہریانہ، مغربی بنگال اور بہار کی اردو اکادمیوں سے مجھے ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے جو اشعار پیش کیے ان میں سے چند یہ ہیں:

میں بڑھتے بڑھتے کسی روز تجھ کو چھو لیتا
کہ گن کے رکھ دیے تو نے مری مجال کے دن

مری جھولی میں وہ لفظوں کے موتی ڈال دیتا ہے
سوائے اس کے کچھ مانگوں تو ہنس کر ٹال دیتا ہے

کیا ان سے ساعت بھی گزر پائے گی اے ساز
وہ در جو تہِ جنبشِ مضطر اب کھلیں گے

دن بیت گیا نان و نمک پانے میں
رسم و رہ و اطوار کو دہرانے میں

لو رات ہوئی آئے تھکے ہارے لوگ
الجھے ہوئے خوابوں کے فسوں خانے میں

عبدالاحد ساز کے بعد صدر جلسہ ڈاکٹر شکیل احمد نے اپنے صدارتی کلمات سے نوازا۔ ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے شاعر موصوف اور سامعین محفل کا شکریہ ادا کیا، اس کے ساتھ ہی یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

(روزنامہ ''فاروقی تنظیم'' پٹنہ)

● کٹھور۔ 8 فروری، چیمبر آف کامرس ہال میں ڈاکٹر انجم جمالی میموریل فاؤنڈیشن کے تحت ڈاکٹر انجم جمالی کی یاد میں جمالی ایوارڈس، ادب وثقافت اور نامہ نگاری کے شعبوں میں نمایاں کارکردگی کے لیے مختلف لوگوں کو دیے گئے۔

پروگرام کے تحت مہمان خصوصی بھارت بھوشن سابق وزیر مملکت شاہد منظور اور ڈاکٹر معراج الدین نے، غزل کے لیے مظفر رزمی، الیکٹرانک میڈیا کے لیے کمال جعفری، سماجی خدمت کے لیے، منوج کمار تعلیمی فروغ کے لیے شانتی نکیتن ودیا پیٹھ کو اعزازات سے سرفراز کیا۔

پروگرام کی صدارت سابق وزیر مملکت شاہد منظور نے کی۔ پروگرام کا آغاز طلبہ کے ذریعے 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' سے ہوا۔ اس کے بعد وندنا اور عبدالستار قادر نے انجم جمالی کی غزلیں پیش کیں۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا" دہلی)

مشاعرے

مری عبادتوں کا لطف مسلکوں میں بٹ گیا
جو مستند امام تھے وہ منبروں پہ سو گئے
عزم شاکری

● نئی دہلی۔ 18 جنوری، ہر سال کی طرح امسال بھی لال قلعہ کے سبزہ زار پر دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام 'مشاعرہ جشن جمہوریت' کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت چاندنی چوک کے ممبر اسمبلی پرہلاد سنگھ ساہنی نے کی۔ افتتاح وزیر خوراک و رسد ہارون یوسف نے کیا جب کہ مہمان خصوصی میں دہلی کی وزیر صحت پروفیسر کرن والیہ اور سابق ڈپٹی اسپیکر شعیب اقبال شامل تھے۔ اس سال مشاعرے میں سامعین کی تعداد نے ایک ریکارڈ بنایا۔ پنڈال میں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی اور بہت سے سامعین کرسیوں کی بجائے فرش پر بیٹھ کر مشاعرے کا لطف لے رہے تھے۔ مشاعرے میں ملک بھر سے آئے شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ شریک شعرا کے اسمائے گرامی ہیں: گلزار دہلوی، مخمور سعیدی، وسیم بریلوی، بشر نواز، ملک زادہ منظور احمد، معراج فیض آبادی، منور رانا، عظیم امروہوی، سنیل کمار تنگ، ملکہ نسیم، جاوید نسیمی، عرفی فیض آبادی، منظر بھوپالی، شکیل شمسی، سلیم صدیقی، اقبال اشہر، الطاف ضیا، فرحت احساس، خورشید اکبر، حنا تیموری، خورشید حیدر، ثاقب گنگوہی، معین شاداب، عزم شاکری، متین امروہوی، شمس رمزی، اقبال فردوسی، شمس تبریزی، اعجاز پاپولر میرٹھی، قاصر سہسوانی، نسیم اختر خادی، ڈاکٹر فرید پربتی، شاہد انور، قاسم امام، کلدیپ سنگھ دیپ، ڈاکٹر نزہت انجم ممتاز راشد، جاوید عرشی، عظمیٰ اختر اور نصرت مہدی وغیرہ۔ مشاعرہ صبح چار بجے کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا" دہلی)

ہم اگر ڈوبے تو کیا کون سے ایسے ہم تھے
شہر کے شہر جہاں زیر زمیں ڈوبتے ہیں
صدیق مجیبی

● دہلی۔ 26 جنوری کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سابرمتی ہوسٹل میں سابرمتی لٹریری کلب کی جانب سے کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت رانچی سے آئے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر صدیق مجیبی نے کی۔ نظامت کے فرائض شفیع ایوب نے انجام دیے۔ شعبہ اردو کے استاذ انوار عالم پاشا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور جے. این. یو میں مشاعرے کی روایت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ یہاں ابتدا سے ہی نہایت خوشگوار ماحول میں مشاعرے ہوتے آئے ہیں جن میں طلبہ اور طالبات بغیر کسی تفریق کے جوق در جوق شرکت کرتے ہیں۔ ناظم مشاعرہ نے یوم جمہوریہ کے حوالے سے اردو زبان و ادب کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے شعرا کا تعارف بطریق احسن کرایا۔ مندرجہ ذیل شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا—صدیق مجیبی (رانچی)، احمد محفوظ (دہلی)، خورشید اکبر (پٹنہ)، خواجہ جاوید اختر (الٰہ آباد)، سرور ساجد (رانچی)، ظہیر رحمتی (دہلی)، شکیل حسن شمسی (دہلی)، شگفتہ یاسمین غزل (کلکتہ)، جاوید انور (وارانسی)، غفران امجد (بنگلور)، شعیب رضا وارثی (دہلی)، ہادی سرمدی، غضنفر قائمی، معید رشیدی، سالم سلیم، راغب اختر، ظفر انصاری، وصی بستوی، برجیش یادو، مسرور صغریٰ وغیرہ۔ کنوینر راغب اختر کے شکریے کے ساتھ رات کے دو بجے مشاعرہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

(ڈاک سے)

خودکشی کرنے پہ آمادہ تھی ناکامی مری
پھر مجھے دیوار پر چڑھتی یہ چیونٹی مل گئی
منور رانا

● نوئیڈا۔ 26 جنوری، 60 ویں یوم جمہوریہ کے موقع پر 'لفظ' تنظیم کی جانب سے سیکٹر 21 کے کمیونٹی سینٹر میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر شہریار اور نظامت ملک زادہ جاوید نے کی۔ شریک مشاعرہ شعرا کے اسمائے گرامی ہیں— شہریار، منور رانا، انجم بارہ بنکوی، اختر وامق، ملک زادہ جاوید، نعمان شوق، طفیل چترویدی، احمد نثار، اسرار چندیلوی۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا" دہلی)

یہ دنیا کتنی بوڑھی ہو چکی ہے کوئی کیا جانے
بظاہر دیکھنے میں نوجواں معلوم ہوتی ہے
راشد عزیز

● نئی دہلی۔ 11 جنوری، غالب اکیڈمی میں پابندی سے ہونے والی ماہانہ ادبی نشست کا اہتمام سکریٹری اکیڈمی ڈاکٹر محمد عقیل احمد کی جانب سے کیا گیا جس میں معزز و ممتاز شخصیات شامل ہوئیں۔ اس ادبی نشست کی صدارت اسد رضا نے کی۔ ادبی گفتگو کے دوران ڈاکٹر راشد عزیز سب اڈیٹر ایوان اردو نے افسانوں کی معنویت اور کہانیوں کے مطالبات نیز نثر کی دیگر خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ نشست میں نثری تحریروں پر ترنم ریاض، شہباز ندیم ضیائی، نسیم عباسی اور ڈاکٹر محمد عقیل کے علاوہ دیگر نے بھی اظہار خیال کیا۔ بعد میں حسب

روایت شعری نشست کا آغاز ہوا جس ان شعرا نے شرکت کی۔۔۔ متین امروہوی، اسد رضا، شمس رمزی، شہباز ندیم ضیائی، حبیب سیفی، ترنم ریاض، راشد عزیز، ذکیہ ظفر، نگار عظیم، نسیم عباسی، سکندر عاقل، آخر میں محمد عاقل نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(روزنامہ ''ہمارا سماج'' دہلی)

رسم اجرا

اردو ادب کے تین بھائی

● پونا۔24 جنوری، حاجی غلام احمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ کے زیر اہتمام محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین پر ایک ضخیم کتاب ''اردو ادب کے تین بھائی'' مصنفہ رفیق جعفر کی رسم اجرا نامور شاعر پروفیسر شہریار نے اعظم کیمپس پونا کے اسمبلی ہال میں انجام دی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے شہریار نے کہا کہ ''اردو ادب کے تین بھائی'' اپنے طرز کی منفرد کتاب ہے جو نئی نسل کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ تینوں بھائیوں محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کی خدمات، اردو ادب، صحافت اور مزاح کے میدان میں یادگار و بے مثال ہیں۔ شہریار نے کہا کہ مجتبیٰ حسین نے طنز و مزاح میں عالمی سطح پر اردو کی آواز پہنچائی ہے۔ پونا میں واقع 123 ایکڑ پر مشتمل اعظم کیمپس کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں انھوں نے کہا کہ سر سید کے بعد اگر کسی جگہ کو علمی تحریک کا مقام دیا جائے گا تو وہ یقیناً اعظم کیمپس ہوگا۔ اس تقریب میں مجتبیٰ حسین نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ جناب مجتبیٰ حسین نے کہا کہ رفیق جعفر نے بڑی محنت اور توجہ کے ساتھ کتاب کے لیے مواد جمع کیا ہے۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے اپنی تقریر میں کہا کہ رفیق جعفر نے صحافت، افسانہ اور شاعری سے اپنی وابستگی کا فائدہ اٹھایا اور ایک ساتھ تین بھائیوں کے فکر و فن پر کسی مبالغہ آرائی کے بغیر گفتگو کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ علاقہ پرستی کے اس دور میں جبکہ بعض اردو اکادمیاں ایوارڈ صرف اپنی ریاست کے افراد کو دے رہی ہیں، پونے میں قائم حاجی غلام محمد اعظم ٹرسٹ نے سابق ریاست حیدرآباد سے تعلق رکھنے والی تین اہم شخصیتوں پر ایک جامع کتاب شائع کروائی ہے۔

اعظم ٹرسٹ کے چیئرمین منور پیر بھائی نے استقبالیہ خطبے میں کہا کہ محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین نے اردو ادب اور صحافت کی جو خدمات انجام دیں ان سے ساری اردو دنیا نے استفادہ کیا۔ محترمہ ممتاز پیر بھائی نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ نہرو سینٹر ممبئی کے کلچرل ڈائرکٹر قاضی لطافت حسین اور معروف شاعر مصطفیٰ شباب (لندن) نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

کتاب کی رسم اجرا کے بعد رات میں مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت پروفیسر شہریار نے اور نظامت عرفان جعفری نے کی۔ ممتاز راشد، نذیر فتح پوری، رفیق جعفر، قاسم امام، قمر صدیقی، عبید اعظمی، اختر جمال، افسر دکنی، محترمہ ممتاز پیر بھائی، ڈاکٹر قمر سرور اور سندر مالیگاؤں کے علاوہ مصطفیٰ شہاب نے کلام سنایا۔ مجتبیٰ حسین اور منور پیر بھائی مشاعرے کے مہمان خصوصی تھے۔

ساحر لدھیانوی حیات اور شاعری

● دربھنگہ۔30 دسمبر، آج محلہ چک رحمت میں سابق صدر شعبۂ اردو ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی پروفیسر سید ضیا الرحمٰن کی کتاب ''ساحر لدھیانوی حیات اور شاعری'' کی رسم اجرا سابق پرنسپل آر۔ بی کالج دلسنگھ سرائے سمستی پور پروفیسر حسن ظہور نظامی کے ہاتھوں انجام پائی۔ تقریب کی صدارت حسن امام درد نے فرمائی۔ پروفیسر عبد المنان طرزی نے کتاب اور صاحب کتاب کے متعلق ایک خوبصورت نظم پیش کی۔ پروفیسر شاکر خلیق نے کتاب کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی۔ ڈاکٹر ارشد جمیل، ڈاکٹر فاران شکوہ یزدانی، پروفیسر ضیا الحق نظر، ڈاکٹر منظر سلطان، ڈاکٹر شاہد حسن، محترمہ نکہت افشاں خاتون، آشکار احمد، ڈاکٹر یاسر حبیب نے بھی کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر امام اعظم نے کتاب کا اجمالی جائزہ پیش کیا جس میں انھوں نے یہ کہا کہ پروفیسر ضیا الرحمٰن کی یہ کتاب ایک تاریخی پس منظر بھی پیش کرتی ہے اور شاعری کے بدلتے ہوئے تیوروں کو سامنے لاتی ہے۔ اس تقریب کی انجام دہی میں نزہت افشاں اور مصنف موصوف کے نواسے حماد سجاد اور ثمیر سلمہ پیش پیش تھے۔

(روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ)

میرے خوابوں کا جہاں

● نئی دہلی۔27 جنوری، حسینی ہال اوکھلا وہار میں ڈاکٹر عظیم امروہوی کی تازہ تصنیف ''میرے خوابوں کا جہاں'' (سفرنامۂ ایران) کا اجرا مولانا حسن کمیلی سکریٹری ادارہ تفہیم اسلام کے دست مبارک سے ہوا۔ جلسے کی صدارت مولانا سید جلال حیدر نقوی سکریٹری القرآن ایجوکیشنل سوسائٹی نے کی۔ جلسے کی ابتدا مولانا جنان اصغر مولائی نے تلاوت کلام پاک سے کی۔ اس کے بعد سلیم امروہوی نے بارگاہ رسالت میں ہدیۂ نعت پیش کیا۔ اجرا کرتے ہوئے مولانا حسن کمیلی نے فرمایا کہ یہ کتاب ڈاکٹر عظیم امروہوی کا ایسا سفرنامہ ہے جس کے ذریعے ایران کے بارے میں قاری کی معلومات میں بے حد اضافہ ہوتا ہے اور موجودہ ترقی یافتہ ایران کی تصویر سامنے آتی ہے۔ مولانا جنان اصغر مولائی نے کہا کہ اس کتاب میں ایران کی ایسی دلکش منظر نگاری کی گئی ہے کہ پڑھنے

والے کو ایران جانے کا اشتیاق پیدا ہو جائے گا۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کہا کہ میرے اس سفرنامے کی چند قسطیں روزنامہ صحافت دہلی میں شائع ہوئی تھیں، جنھیں پڑھ کر قارئین کا اصرار تھا کہ مکمل سفرنامے کو کتابی شکل دی جائے۔ میں کتاب کے ناشر، اس جلسے کے مہمانان اور شرکا کا شکر گزار ہوں۔ آخر میں صدر جلسہ مولانا سید جلال حیدر نقوی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اس کتاب میں ڈاکٹر عظیم امروہوی نے ایران کی سچی تصویر پیش کی ہے اور مغربی میڈیا نے جو ایران کی شبیہ بگاڑنے کی کوشش کی ہے وہ غلط فہمیاں بھی اس کتاب سے دور ہوتی ہیں۔ مصنف کا طرز تحریر اتنا دلکش ہے کہ کتاب شروع کرنے کے بعد درمیان میں چھوڑنے کو قاری کا دل نہیں چاہتا۔

(روزنامہ "ہمارا سماج" دہلی)

'دروازہ ابھی بند ہے' اور 'قلم بول اٹھا'

● گیا۔ 9 فروری، مرزا غالب کالج میں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں احمد صغیر کے ناول "دروازہ ابھی بند ہے" اور کرشن چندر چودھری کمل کے شعری مجموعے "قلم بول اٹھا" کا مجاہد فرحت قادری، پروفیسر محفوظ الحسن اور پروفیسر حسین الحق کے ہاتھوں مشترکہ طور پر کیا گیا۔ ڈاکٹر ظفر نے احمد صغیر کے ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ احمد صغیر نے اپنے ناول میں دہشت گردی کے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ "دروازہ ابھی بند ہے" جب کھلے گا تو کیا ہوگا یہ احمد صغیر نے ظاہر نہیں کیا ہے۔ کرشن چندر چودھری کے شعری مجموعے کی دو نظموں کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "ماں مجھے مت روکو" اور "مہوا" کافی اچھی نظمیں ہیں۔ جبکہ پروفیسر حسین الحق نے کہا کہ احمد صغیر ایک منجھے ہوئے فنکار ہیں ان کا یہ ناول تخلیقی اور صحافتی ہے۔ کمل نے اردو میں لکھ کر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ اردو سب کی زبان ہے۔ پروفیسر محفوظ الحسن نے کہا کہ احمد صغیر کے یہاں موضوع کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ کمل کے دل میں انسانیت کا درد ہے۔ ڈاکٹر قسیم ابن صمد نے احمد صغیر کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے فروری، 2002 کے فسادات کی تصویر کو بڑی ایمانداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کمل کے شعری مجموعے پر بھی انھوں نے اپنا تبصرہ پیش کیا۔ مسعود منظر نے کہا کہ احمد صغیر اب ایک معتبر آواز بن چکے ہیں۔

(روزنامہ "راشٹریہ سہارا" دہلی)

چراغ دیر

● نئی دہلی۔ 14 جنوری، 'چراغ دیر' اردو کے ابھرتے ہوئے صحافی اور ٹی وی فلم اسکرپٹ رائٹر غوث سیوانی کی بہترین تحقیقی کوشش ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں اردو کے 52 ہندو شاعروں کی حیات و خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ کتاب کی ابتدا شاہ جہاں کے عہد کے معروف فارسی و اردو شاعر چندر بھان برہمن سے ہوتی ہے جب کہ اختتام موجودہ عہد کے معروف شاعر چندر بھان خیال پر ہوتا ہے۔ اردو زبان کے ہندو شاعروں کے حالات زندگی اور خدمات کا اس کتاب میں تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ تحقیق ٹیلی ویژن سیریل کے لیے کی گئی تھی جسے کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا خاص پہلو یہ ہے کہ معروف ہندو شاعروں کے علاوہ بڑی تعداد میں غیر معروف ہندو شاعروں کو بھی اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مدیر "نئی دنیا" شاہد صدیقی کا کہنا ہے کہ یہ کتاب اس موضوع پر کافی اہم ہے۔ مزید ہندو شاعروں کی خدمات پر کام ہونا چاہیے تاکہ لوگوں کے سامنے یہ بات کھل کر آئے کہ اردو کسی خاص طبقے کی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ روزنامہ "ہندوستان ایکسپریس" نئی دہلی کے ایڈیٹر احمد جاوید نے کہا کہ غوث سیوانی جو کام بھی اپنے ذمے لیتے ہیں نہایت سلیقے، سنجیدگی اور محنت سے کرتے ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ ٹیلی ویژن پروگرام کے لیے ہوئی تحقیق کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے مگر معیاری اور مستند ہے۔ جامعہ ہمدرد یونیورسٹی کے اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم نے کہا کہ اس قسم کی کتابیں بہت کم شائع ہو رہی ہیں لہٰذا اسے لائبریریوں میں رکھنا مستقبل کے محققین کے لیے کارآمد ہوگا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیکچرر ڈاکٹر محمد مشتاق تجاوری نے کہا کہ غالب کے شاگردوں میں کئی ہندو بھی تھے جو بہت اچھے شاعر تھے مگر وہ تاریخ کے اوراق میں گم ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں کئی ایسے شاعروں کی خدمات کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین اور اردو کے معروف شاعر چندر بھان خیال نے امید ظاہر کی کہ یہ چراغ بہت سے چراغوں کو روشن کرے گا۔ روزنامہ "سنگم" پٹنہ کے ایڈیٹر اور ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر ایم. اعجاز علی نے کہا کہ "چراغ دیر" کی شکل میں نہ صرف اردو کے ہندو شاعروں کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے بلکہ یہ کتاب کئی صدیوں کی اردو شعر و سخن کی اجمالی تاریخ بھی ہے۔

(روزنامہ "ہندوستان ایکسپریس" دہلی)

[illegible]

● نئی دہلی۔ 18 جنوری، مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے ناظم عمومی مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی نے فضا ابن فیضی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور اسے دینی، علمی اور ادبی دنیا کا عظیم خسارہ قرار دیتے ہوئے ان کے پسماندگان سے قلبی تعزیت کی ہے۔ مولانا نے کہا کہ فضا ابن فیضی ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے جد امجد ابوالمعالی محمد علی فیضی اور والد مولانا منظور حسن اپنے دور کے معروف علمائے دین میں سے تھے۔ فیض الحسن فضا ابن فیضی نے خاندانی روایات کے مطابق عربی، فارسی اور دیگر علوم کی تعلیم حاصل کی، مدرسہ عالیہ، مدرسہ فیض عام اور مؤ کے اکابر علما سے

اکتساب فیض کیا۔ مولانا فیض الحسن فیض سے مشورۂ سخن کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ فضا ابن فیضی نے کم وبیش چالیس سال تک چمن شعر کی لالہ کاری کی اور اپنے خون جگر سے اردو شاعری کو رعنائی وتوانائی بخشی۔ عربی اور فارسی کے عمیق مطالعے نے ان کی زبان وفکر کو ایک خاص کلاسیکی وقار عطا کیا۔ سرشاخ طوبیٰ (حمد ونعت ومنظومات 1990)، سفینۂ زرگل (غزلیات ورباعیات 1973)، پس دیوار حرف (غزلیات 1991)، شعلۂ نیم سوز (منظومات 1978)، غزال مشک گزیدہ (رباعیات)، دریچۂ سیم وسمن (غزلیات 1989)، سبزۂ معنی بیگانہ (غزلیات 1994)، لوح آشوب آگہی (منظومات)، آئینۂ نقش صدا (غزلیات)، ان کے مشہور مجموعہ ہائے کلام ہیں۔ مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی نے کہا کہ بلاشبہ فضا ابن فیضی اردو زبان کے بلند پایہ شاعر تھے۔ مختلف ادبی وسماجی اداروں نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے گراں قدر ایوارڈ سے نوازا۔ ان کے فن اور شخصیت پر پی. ایچ. ڈی کا مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔ مولانا سلفی نے کہا کہ فضا ابن فیضی یکم جولائی، 1923 کو مئو کے محلہ جمال پور میں پیدا ہوئے اور وہیں 17 جنوری، 2009 بروز ہفتہ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ آپ 86 برس کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں شامل ہیں، لڑکوں میں سے دو کی پہلے ہی وفات ہو چکی ہے۔

(روزنامہ "ہندوستان ایکسپریس" دہلی)

● وارانسی۔ 23 جنوری، بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک تعزیتی نشست میں فضا ابن فیضی کی شعری خصوصیات کو یاد کیا گیا اور انھیں اپنے عہد کا ایک پرگو شاعر قرار دیتے ہوئے ان کے لہجے اور فنی ومعنیاتی کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ صدر شعبہ ڈاکٹر عبدالسلیم نے نشست کی صدارت کرتے ہوئے فضا ابن فیضی کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ فیضی نے مختلف اصناف میں اپنی تخلیقات پیش کی ہیں۔ غزل، رباعی اور نظم پر مشتمل سات مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مرحوم دور افتادہ علاقے مئو میں رہنے کے باوجود اپنی تخلیقی جہات کی بدولت ہند وپاک میں اپنی شناخت قائم کی۔ اس موقعے پر پروفیسر نسیم احمد نے کہا کہ فضا ابن فیضی کی شاعری اپنے حیات افروز خیالات اور شعری لہجے میں جوش وتوانائی کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ ان کی شاعری میں حرکت عمل کا درس ملتا ہے نیز ان کے یہاں مقصد وفن کا صحت مند امتزاج ہے۔ ڈاکٹر یعقوب یاور نے کہا کہ فضا ابن فیضی کے کلام میں کئی میلانات کارفرما ہیں جنھیں ان کی شاعری کے بنیادی محرکات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے کلام پر ان کے ذاتی درد وغم کا پرتو واضح ہے جس کا رشتہ ان کے فن اور ادب کے آفاقی تصور کے تحت عام انسانی درد وغم سے مل گیا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ فضا ابن فیضی کی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ یہ اخلاقی قدروں کا شعور عطا کرتی ہے۔ ان کی شاعری کے سوتے ان کے فکری عقیدے سے پھوٹتے ہیں جس میں انسانیت کے احترام اور کردار وعمل کی صالحیت کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر مشرف علی نے فضا ابن فیضی کی نظموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی نظموں میں داخلی اور ذاتی احوال وکوائف کو سادگی کے ساتھ خوبصورت اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

(روزنامہ "ہندوستان ایکسپریس" دہلی)

● اندور۔ 18 جنوری، یہاں فضا ابن فیضی کے انتقال کی خبر سے ادبی حلقوں میں غم اور افسوس کی لہر دوڑ گئی۔ 18 جنوری، 2009 اتوار کو مسلم لائبریری کی جانب سے ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ حدیث انصاری صدر شعبۂ اردو، اسلامیہ کریمیہ کالج، اندور نے مرحوم سے اپنی گہری عقیدت، قربت اور وابستگی کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ فضا کی شاعری عصر حاضر کی آئینہ داری کرتی ہے۔ ان پر تحریر کیے ہوئے اپنے تحقیقی مقالے برائے Ph.D کا ذکر کرتے ہوئے حدیث انصاری نے ان سارے گوشوں کو واضح کیا جن سے مرحوم فضا ابن فیضی کی شخصیت اور ان کے ادبی مقام کا تعین ہوتا ہے۔ انھوں نے فضا صاحب کے کئی ایسے اشعار پیش کیے جن سے ان کی فکر پر روشنی پڑتی ہے، جیسے یہ اشعار:

فضا نہ پوچھ کہ گزری ہے زندگی کیسے
ہنر کی دین تھی آرائش ہنر میں کٹی

لفظ ومعنی کی طرف یوں تو سفر ہے سب کا
کیوں مرا فن وہی ٹھہرے جو ہنر ہے سب کا

ڈاکٹر عزیز اندوری، عزیز انصاری اور عزیز عرفان نے بھی مرحوم فضا کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی۔ رشید اندوری نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

● شاہ جہانپور۔ شاہ جہانپور کے ایک کہنہ مشق اور ممتاز شاعر سید احمد سحر کا 25 جنوری کو انتقال ہو گیا۔ اور 26 جنوری، کی صبح سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 74 سال تھی۔ پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔

سحر صاحب کا کلام اخبارات ورسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ کچھ مدت پہلے ان کا منتخب کلام کتابی صورت میں بھی منظر عام پر آیا تھا۔ انھیں غزل سے خاص شغف تھا لیکن انھوں نے رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان کی فکر میں تازگی اور لہجے میں کلاسیکی رچاؤ تھا۔ شعر وسخن کے ایک خاموش خدمت گزار کی حیثیت سے انھیں یاد رکھا جائے گا۔

□□□

تبصرہ وتعارف

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

مصنف: خلیل الرحمٰن اعظمی

صفحات: 410، قیمت: 241 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: فیاض احمد وجیہ، 117، ستلج ہاسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔67

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی کی تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے، جو اصل میں ان کا پی. ایچ. ڈی (1957) کا مقالہ ہے۔ اس گراں قدر مقالے کو پہلی بار انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ نے 1972 میں شائع کیا تھا، اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کی غیر معمولی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نے اپنے خاص اشاعتی منصوبے کے تحت اسے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کتاب ترقی پسند تحریک کے فکری خدوخال اور ترقی پسند ادیبوں کے کارناموں کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس موضوع پر اور بھی کتابیں ہیں مگر یہ ان میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ اس کے مشتملات میں تعارف اور مقدمے کے علاوہ تین ابواب ہیں، جو اس طرح ہیں۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک، ترقی پسند ادبی سرمایے کا جائزہ اور ترقی پسند تنقید ایک تجزیاتی مطالعہ۔ رشید احمد صدیقی اس مقالے کے نگراں اور ممتحن تھے۔ تفاخر کے طور پر ان کی رپورٹ سے اہم اقتباسات کو شامل کیا گیا ہے۔ انھوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی کے تلاش وتحقیق کے طریقۂ کار، قابل قدر مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب اور تجزیہ کی تعریف و توصیف کی ہے اور ان کے ادبی اسلوب کو قابل اطمینان قرار دیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جو مقدمہ لکھا ہے، وہ کئی معنوں میں فکر انگیز ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں" ترقی پسندی کا تصور نہ تو جامد ہے اور نہ آج اور صرف آج کی پیداوار ہے بلکہ یہ ایک مسلسل و نامیاتی عمل ہے جو ماضی کی بہترین روایات اور نئے دور کے مطالبات کو ہم آہنگ کر کے ایک 'زندہ رو' کی شکل میں جاری رہتا ہے۔" (ص۔17)، خلیل الرحمٰن اعظمی نے ترقی پسند ادبی تحریک کا مطالعہ پوری احتیاط اور انہماک سے کیا ہے۔ یہ مطالعہ سنجیدہ اور غیر جانب دارانہ نقد وشعور کی مثال ہے۔ بعض ترقی پسندوں کی طرح انھوں نے جذبات کا مظاہرہ نہیں کیا ہے، بلکہ غیر جذباتی انداز میں ترقی پسند ادبی تحریک کے خدوخال واضح کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ انھوں نے بجا طور پر یک طرفہ طرز تنقید کو نشانہ بنایا ہے۔

اس سلسلے میں سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" (1951) کے بارے میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اصل میں تحقیق وتنقید کے تقاضے کو پورا کرنے اور اس کے منصب اصلی سے عہدہ برآ ہونے کی غیر معمولی کوشش ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کسی بھی نوع کے مطالعے میں معروضیت (Objectivity) کے خواہاں ہیں۔ یہ مقدمہ معاصر ادبی رویّوں کے پیش نگاہ کئی معنوں میں اہمیت کا حامل ہے اور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ انھوں نے اپنے طریقۂ کار اور طرز تنقید کی جو وضاحت کی ہے، اس کے عملی انطباق میں پورے کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند ادبی پس منظر، تاریخ اور اس کے تدریجی ارتقا، مصنفین کے مختلف رجحانات، موافقین ومخالفین کے مباحث، سیاسی حالات، سب پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے ادب کے مطالعے میں فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ تخلیق ادب کے محرکات پر بھی غور کیا ہے۔ وہ سماج کی تاریخی تبدیلیوں کو اس ادبی تحریک کے مطالعے میں خاص اہمیت دیتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس تحریک کے ہر پہلو پر نگاہ کی ہے اور ان پہلوؤں کو نشان زد کیا ہے جو اس تحریک کو ادب کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں سے دور لے گئے۔ انھوں نے نعرہ بازی، گھن گرج، شور وغوغا اور پروپیگنڈہ ایسے غیر ادبی رویوں کی چھان پھٹک کی ہے۔ انھوں نے سردار جعفری کے اس مضمون کا بڑی خوبی سے تجزیہ کیا ہے جس میں فیض کے مشہور شعر کو معنی کی کثرت کے باعث ترقی پسند شعریات کی نفی سے تعبیر کیا گیا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

خلیل الرحمٰن اعظمی اس شعر کو محض اس لیے معتوب کرنے پر آمادہ نہیں ہیں کہ اس میں استعارے کے حسن اور رمز وایما سے کام لیا گیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، چوں کہ ترقی پسند شعریات کو جامد قرار نہیں دیتے، اس لیے پورے پس منظر اور زمانی تصور میں اس کے امکانات تلاش کرتے ہیں۔ "مستقبل کی ترقی پسند شاعری ماضی کی دونوں تحریکوں یعنی ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کے شعری کارناموں کے بہترین عناصر کو جذب کرے گی اور دونوں تحریکوں کی خامیوں سے بچنے کی کوشش کرے گی۔" (ص۔202) انھوں نے شاعری کی طرح افسانے پر بھی گفتگو کی ہے اور یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ "ترقی پسندی کے سکّہ بند تصور کے بجائے وسیع المشربی کا رجحان نمایاں ہے۔"

(ص۔ 235)، دیگر اصناف ادب میں ناول، ڈراما، طنز و مزاح، رپورتاژ، ڈائری اور مکاتیب وغیرہ کو بھی انھوں نے اپنے مطالعات میں رکھا ہے۔ ترقی پسند تنقید کے مطالعے میں انھوں نے مختلف مباحث اور اقتباسات کو جمع کر کے پورے منظرنامے کو مرتب کرنے کی سعی کی ہے اور ترقی پسند تنقید کے پیچ و خم کے عنوان سے ان مباحث کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ پس لفظ کے تحت تحقیق و تنقید کے تعلق سے اپنے معروضات کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مطالعے میں پریم چند اور جوش کا ذکر ضمنی طور پر کیا ہے، چوں کہ ان کی ذہنی اور فکری نشو و نما ترقی پسند تحریک سے پہلے ہو چکی تھی۔'' (ص۔ 387)

مجموعی طور پر ترقی پسند ادبی تحریک اور ادب کے وسیع تر دائرۂ عمل سے آگاہ ہونے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ کتاب بہت عمدہ چھپی ہے، پروف خوانی پر بھی توجہ دی گئی ہے مگر بعض خامیاں راہ پا گئی ہیں، مثلاً۔ کس سحر کا شاعر کو انتظام تھا (ص۔ 198)، کرشن چندر کے مذاحیہ مضامین (ص۔ 257)، ایک گدھے کے سرگذشت (ص۔ 259)، سرورق پر مصنف کو مرتب لکھا گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کی پہلی اشاعت (مارچ، 1972) میں کتابیات موجود ہے، اور بعد کے ایڈیشنوں مثلاً۔ 2002 کے ایڈیشن میں کتابیات شامل نہیں ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، قابل مبارک باد ہے جس نے اپنے پہلے (2008) ایڈیشن میں مطالبات تحقیق و تنقید کو ملحوظ رکھا اور کتابیات کو نمایاں طور پر جگہ دی ہے۔ اس سے ادب کے طالب علم کو صحیح ماخذ تک رسائی حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

تحقیق کا فن/ گیان چند جین

صفحات: 650، قیمت: -/170 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066
مبصر: معید رشیدی، 142 جہلم ہاسٹل، جے۔ این۔ یو، نئی دہلی۔ 110067

اردو میں اصول تحقیق پر ایک جامع کتاب کی ضرورت تھی، اگرچہ اس کتاب سے قبل اس موضوع پر اردو میں متعدد کتابیں آ چکی تھیں۔ ان میں چند کے نام یہ ہیں۔ ''متنی تنقید'' از ڈاکٹر خلیق انجم 1967، ''مبادیات تحقیق'' از عبدالرزاق قریشی 1968، ''اصول تحقیق و ترتیب متن'' از ڈاکٹر تنویر احمد علوی 1977، ''عمادالتحقیق'' از پروفیسر کلب عابد 1978، ''ادبی اور لسانی تحقیق: اصول اور طریق کار'' از ڈاکٹر عبدالستار دلوی 1985۔ زیر نظر کتاب کا نام رچرڈ الٹک کی کتاب "The art of literary research" سے ماخوذ ہے۔ مصنف نے کل بائیس ابواب قائم کیے ہیں۔ پہلا باب تحقیق کی تعریف اور محقق کے منصب پر ہے جس میں مختلف مفکرین کی آرا کے ذریعے تحقیق کی اقسام اور مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تحقیق و تنقید کے اشتراک و اختلاف، موضوع کے انتخاب، تحقیق کا دوسرے علوم و فنون سے رشتہ، محقق اور نگراں کے اوصاف سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرا باب تحقیقی مقالے کی نوعیتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ مقالے کی تیاری میں پہلے مفروضہ (Hypothesis) قائم کیا جاتا ہے، پھر کلیہ (Thesis) وجود میں آتا ہے۔ ٹرم پیپر، رپورٹ، ڈزرٹیشن (Dissertation) اور تھیسس میں کیا فرق ہے۔ مقالے کو کتنے صفحات پر مشتمل ہونا چاہیے اور تحقیق کی منزلیں یا اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ دوسرے باب میں یہ تمام امور سمٹ آئے ہیں۔ تحقیق میں بنیادی چیز موضوع کا انتخاب ہے۔ موضوع سے تحقیق کار کی دلچسپی ضروری ہے۔ تحقیقی موضوعات کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ کس کے لیے کیا موضوع مناسب ہے، کیا غیر مناسب۔ موضوع کی تلاش کا مسئلہ اہم ہے۔ مقالہ تحریر کرنے سے قبل خاکہ (Synopsis) تیار کرنا ضروری ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ذہنی طور پر مقالے کی ہیئت متعین ہو جاتی ہے۔ ترتیب تحقیقی مقالے کا جوہر ہے۔ اس لیے خاکہ مرتب، چست اور منظم ہونا چاہیے۔ گیان چند کہتے ہیں کہ مقالے کی ترتیب زمانی اعتبار سے ہونی چاہیے۔ معلوم سے نامعلوم کا انکشاف کیجیے۔ سادہ سے پیچیدہ کی طرف بڑھیے۔ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا تقابل و تخالف کیجیے۔ سبب سے نتیجہ نکالیے۔ زمانی ترتیب کے ضمن میں موصوف صراحت کرتے ہیں کہ زمانی ترتیب میں عموماً سہولت رہتی ہے، مگر ہر قسم کے موضوع کے لیے یہ ممکن نہیں۔ یہ ایسا مجرب نسخہ نہیں جو ہر مرض کی دوا ہو۔ تاریخی اور موضوعاتی ترتیب دونوں کی اہمیت برابر ہے۔ انھوں نے بطور نمونہ کچھ خاکے بھی بنا دیے ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

مواد کی فراہمی کسی بھی نوعیت کی ایماندارانہ تحقیق کے لیے دشوار گزار مرحلہ ہے۔ ماخذ کے سلسلے میں کتاب سب سے اہم ماخذ ہے جس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مطبوعہ اور قلمی یا خطی۔ مخطوطات، جرائد، خطوط، تاریخی دستاویزات، قانونی دستاویزات۔ بشمول مقدمے کی مسل، وصیت نامے، بصری مواد میں دستاویزی فلم، مائکروفلم (Micro Graphics)، سمعی مواد میں کیسیٹ، ریڈیو کے ادبی پروگرام (تقریریں، مباحثے وغیرہ)، انٹرویو وغیرہ دیگر ماخذوں میں ہیں۔ ان ماخذوں تک رسائی کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ تحقیق میں دوران مطالعہ نوٹ کیسے تیار کریں۔ نوٹ لینا بالکل شخصی عمل ہے لیکن اس میں احتیاط ضروری ہے۔ تحقیق کار کو چاہیے کہ نوٹ لیتے وقت تحریر بالکل صاف ہو، وہ متن کی صحیح قرأت کرے اور بالکل صحیح نقل کرے کیوں کہ لائبریری چھوڑنے کے بعد اپنے نوٹوں پر ہی تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ نوٹ مکمل ہو۔ اگر بعد میں کچھ شک ہو تو اصل متن کی طرف دوبارہ رجوع کرنا چاہیے۔ اس عمل میں بعض اوقات جھنجھلاہٹ تو ہوتی ہے مگر گیان چند کے الفاظ میں ''تحقیق بڑی حاسد داشتہ ہے۔ وہ کسی دوسری محبوبہ کی شرکت برداشت نہیں کر سکتی یعنی یہ پسند نہیں کرتی کہ جو وقت اسے دیا جا رہا ہے اس میں مخل ہو کر کوئی دوسرا اس وقت میں حصہ دار ہو جائے۔''

گیان چند اس بات پر زور دیتے ہیں کہ حقائق کو حتی الامکان تاریخی ترتیب سے بیان کیجیے۔ واقعات کی تاریخیں درج کیجیے۔ حقائق سادہ اسلوب میں قلم بند کیجیے۔ عبارت آرائی بالکل نہ ہو۔ بے جا ایجاز و اختصار بھی نہ ہو۔ مزاح اور مبہم اظہارات سے بچیے۔ اقتباسات اور مقولے مختصر ہوں اور بالکل صحیح نقل کیے گئے ہوں۔ داد طلب انداز اختیار نہ کیجیے۔ وہ بیلک کے اقوال نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تحقیق کو غیر ضروری طور پر پیچیدہ نہیں ہونا چاہیے۔ جو کچھ کہنا ہے کہہ دیجیے اور رخصت ہو جایئے۔ درازنفسی، تکرار، موضوع سے ہٹ جانا تحقیقی تحریر میں جائز نہیں۔ اپنی تحریر کو دوسروں کے طویل اقتباسات سے نہ سجایئے۔ مقالے کے مطالب کو منطقی ترتیب دیجیے۔ وہ بیکر کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ پورے مقالے میں وحدت کا شعور ہونا چاہیے۔ تحقیق میں دیانت داری اور غیر جانبداری بہت ضروری ہے۔ ماخذ کے اعتراف میں کسی طرح کی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ کتاب کا نواں باب زبان و بیان سے متعلق ہے جس میں متعدد مثالوں کے توسط سے اس کی نشاندہی کی گئی ہے کہ تحقیق کی زبان کس نوعیت کی ہو۔ اس ضمن میں زبان کی صحت اور قطعیت پر زور دیا گیا ہے۔ اس باب کے آخر میں مقالے کی نظر ثانی اور تبییض پر توجہ دلائی گئی ہے۔

مقالے کی تسوید پہلا مسودہ تیار کرنے کا نام ہے۔ اس کے بعد دہرانے یا نظر ثانی کی باری آتی ہے۔ آخری مرحلہ تبییض کا ہے۔ اس کتاب کا سب سے اہم باب ''ہیئت'' ہے جس میں تحقیقی مقالے کی اقسام سے لے کر مقالے میں استعمال ہونے والے رموز و اوقاف، کتاب بندی اور فہرست سازی کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ مقدمہ کیسے لکھا جائے، شکریے کے اعترافات کہاں ہوں، صفحوں کا نمبر شمار (Pagination) کا طریق کار کیا ہے، ابواب کے ساتھ ذیلی ابواب کیسے قائم کیے جائیں، متن میں اشخاص کے نام کیسے لکھے جائیں۔ اردو میں اکثر ناموں کے ساتھ تعظیمی سابقے اور لاحقے لائے جاتے ہیں۔ مغرب میں یہ طریقہ رائج نہیں۔ متن میں کتابوں کا نام کیسے تحریر کیا جائے، اقتباسات کس طرح دیے جائیں، حوالے اور حواشی کیسے لکھے جائیں، وغیرہ۔ باب کے آخر میں ضمیمہ، فرہنگ سازی، کتابیات اور اشاریے کے آداب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

گیارھویں باب سے لے کر آخری باب تک مختلف موضوعات پر مبنی تحقیق کے کچھ عملی پہلوؤں پر گفتگو ہے۔ ایک ادیب پر مقالہ کیسے لکھا جائے، ادبی تاریخ، تدوین متن، بین العلومی تحقیق، ادبی لسانیات، تصحیح تحقیق، صنف، تحریک، دبستان یا رجحان پر تحقیق کی جائے تو اس کے کیا تقاضے ہیں، ان تمام امور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو میں تحقیق کے اصول اور طریق کار پر یہ سب سے منضبط کتاب ہے۔ ریسرچ اسکالروں کے لیے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ یہ تحقیق کی مبادیات سے لے کر دیگر تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

تنقید (ششماہی)

صفحات: 272، قیمت: مدارد
ناشر: شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 202002
مبصر: ابوبکر عباد، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔ 110007

ہندوستان سے شائع ہونے والے اردو رسائل کی تعداد بہت زیادہ لیکن ادبی اور تنقیدی رسائل کی تعداد خاصی کم ہے، جن میں سے محض چند کو معیاری کہا جاسکتا ہے۔ رسالے کے معیار کو بحال رکھنے کی ضمانت اگر قاری اور قلمی معاونین کی ہوتی ہے تو اس سے کئی گنا زیادہ ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے مدیر کے شانوں پر ہوتا ہے کہ وہ اپنی سنجیدہ فکر، ادبی مذاق، علمی لیاقت، وسیع النظری اور تنقیدی صلاحیت کو بروئے کار لاکر نہ صرف قارئین کی روحانی بالیدگی کا سامان مہیا کرے، انھیں مختلف زبانوں میں رونما ہونے والی تحریکات و رجحانات سے آگاہی بخشے، اور تفہیم متن اور قرأت کے مختلف طریقوں سے واقف کرائے بلکہ اردو معاشرے میں ادب و تنقید کے صالح ذوق کو بھی پروان چڑھائے۔ ماضی بعید میں علامہ نیاز فتح پوری اور شاہد احمد دہلوی اور ماضی قریب میں محمود ایاز اور پروفیسر شمس الرحمان فاروقی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ پروفیسر قاضی افضال حسین کو اس سلسلے کی ایک کڑی کہنا کسی طور مبالغہ نہ ہوگا کہ ''تنقید'' کے شمارے اس کے بیّن ثبوت ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے جاری ہونے والا یہ ششماہی رسالہ اگرچہ اپنی عمر کی ابھی تیسری منزل میں ہے لیکن علمی اور ادبی حلقوں میں جس طرح سے اس کی پذیرائی اور تحسین ہوئی ہے اسے فال نیک سمجھنا چاہیے۔ ہندوستان سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اردو کے ذاتی ملکیت والے بعض رسالے اپنے مدیر کے ذہنی تعصبات کی اشاعت اور اپنے ممدوح کی دفاعی جنگ میں مصروف ہیں تو بعض اداروں کے رسالے اپنے مدیر کے احباب کی میزبانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں، ایسے حالات میں 'تنقید' کے مدیر کا یہ موقف لائق قدر ہے کہ: ''تنقید کسی فرد کی ملکیت یا کسی تحریک کا نمائندہ نہیں بلکہ ملک میں ادب کے اہم شعبے کی فکری/علمی ترجیحات کا نمائندہ ہے۔ ہمیں کسی تحریک، ادبی موقف یا ضروری بحث سے پرہیز نہیں۔ اور ہم ادبی مباحث میں اقداری فیصلوں سے بھی گریز نہیں کرتے مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ بحث کی سطح بلند، پیرایۂ اظہار معیاری اور گفتگو عالمانہ ہو۔'' (اداریہ: تنقید: شمارہ 1) اسی طرح مدیر نے رسالے میں شمولیت کے لیے مضمون نگار کی منصبی، فکری، علاقائی یا گروہی حیثیت کی بجائے مضامین کی ادبی اور فکری سطح کو معیار قرار دیا ہے۔

'تنقید' کے پہلے شمارے کا موضوع ''اردو افسانے کی ایک صدی''

تھا، دوسرے شمارے کا موضوع ''مابعد جدیدیت'' تھا، جس میں لاتشکیل، مابعد جدیدیت، نئی تاریخیت اور تانیثیت جیسے اہم مباحث پر مضامین شامل تھے۔ زیر نظر تیسرا شمارہ علامہ اقبال کی محض ایک نظم ''ذوق وشوق'' کے مطالعہ کے لیے مخصوص ہے۔ غالباً اردو میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے کسی رسالے کا یہ پہلا شمارہ ہے جو ایک ہی فن پارے کو متعدد طریقوں سے سمجھنے یا مختلف طریقوں سے اس کی تعبیر کی کوشش پر مبنی ہے۔ اس شمارے میں اس عہد کے ایک اہم مستشرق Dr. Stephan POPP کے ایک انگریزی مضمون Deconstruction of Zauq -u Shauq کے علاوہ سترہ ذی علم اور اہل قلم حضرات کے ''ذوق وشوق'' سے متعلق نتائج فکر شامل ہیں۔ فہرست میں ایک آدھ کے علاوہ بیشتر نام معتبر، مستند اور لائق ذکر ہیں، مثلاً ڈاکٹر فتح محمد ملک، مولانا غلام رسول مہر، علامہ سید ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر شمس الرحمان فاروقی، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر غلام رسول ملک، شفیق فاطمہ شعری، پروفیسر سعید الظفر چغتائی، پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر سید محمد ہاشم، مضطر مجاز اور محمد ظہیر الدین احمد۔

کسی فن پارے کے اس نوع کے مطالعہ کا بنیادی محرک بقول قاضی افضال حسین یہ تصور ہے کہ متن کے کوئی حتمی معنی یا اس کی کوئی یک جہتی تعبیر نہیں ہوتی، اور نہ ہی مطالعۂ متن کا کوئی ایسا طریقہ متعین ہے جس پر سب لوگ متفق ہوں۔ ان کے خیال میں متن میں معنی کی کثرت کا یہ تصور زبان کی مخصوص شعریات، تہذیبی روایت، متن کے بدلتے ہوئے سیاق وسباق، وقت کے ساتھ مطالعۂ متن کے اصولوں میں تبدیلی اور قاری کی ذہانت وبصیرت سے بھی استحکام حاصل کرتا ہے۔

رسالے کے مدیر نے اس نظم کو خصوصی مطالعے کے لیے منتخب کرنے کی تین وجہیں بتائی ہیں۔ پہلی یہ کہ اقبال کی یہ نظم اردو کی چند بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ دوسری یہ کہ خود علامہ اقبال نے اس نظم کی تنظیم پر کافی توجہ صرف کی ہے، اور تیسری وجہ یہ کہ اشاعت کے بعد سے اب تک یہ نظم مسلسل مطالعہ کا موضوع رہی ہے۔

ظاہر ہے 'تنقید' کا زیر نظر شمارہ 'ذوق وشوق' کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے اور اس کے متعدد جہات کا احاطہ کرنے کے باوجود یہ دعوی نہیں کرتا کہ متن کی تفہیم مکمل اور اس کی حتمی تعبیر ہو چکی ہے، بلکہ رسالے کے مدیر کا موقف تو ہمیں یہ عندیہ دیتا ہے کہ ابھی اس کی مزید تعبیر ممکن ہے اور معنی کے بہت سے جہات کو ہنوز روشن ہونا ہے۔

دھوپ کے پودے

شاعر: ارشد کمال

صفحات: ، قیمت: -/100 روپے

ناشر: ارشد کمال، جی-64، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

مبصر: عطا عابدی، معرفت بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-800004

''دھوپ کے پودے'' ارشد کمال کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو 19 نظموں اور 45 غزلوں پر مشتمل ہے۔ ارشد کمال برسوں سے کبھی تواتر سے اور کبھی قدرے تعطل سے مختلف اردو رسائل کے ذریعے اپنی شعری موجودگی درج کراتے رہے ہیں۔ ''دھوپ کے پودے'' کی شاعری ارشد کمال کی زندگی کی طرح ہی صالحیت اور مقصدیت کا احساس کراتی ہے۔ زندگی کی طرح وہ شاعری کو بھی اخلاقی وتہذیبی صفات سے ممیز دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں۔ البتہ وہ یہ التزام ضرور کرتے ہیں کہ شاعری کا آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلنے کے بجائے حرارت وانضباط کا مرقع ثابت ہو۔

زیر نظر مجموعے کی نظمیں ہوں یا غزلیں دونوں مشترک فکر پیش کرتی ہیں۔ خود شاعر نے غالباً اسی حقیقت کو مزید واضح کرنے کے لیے ہر نظم سے قبل غزل کا ایک شعر درج کیا ہے۔ متعلقہ شعر کے بنیادی خیال کی توضیح یا معنوی تشریح متعلقہ نظم میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ ممکن ہے، بعض نظموں سے موضوعی مطابقت بالکلیہ واضح نہ ہوتی ہو لیکن پس منظر یا بین السطور میں متعلقہ شعر ونظم کی فکری جڑیں ایک ہی زمین سے اپنی غذا کشید کرتی ہیں۔

مجموعے میں عرفان صدیقی، خلیل الرحمن اعظمی اور اختر الایمان کی آرا شامل کی گئی ہیں جو بالترتیب لفظوں کی اہمیت، معیاری غزل کی پہچان اور اچھی شاعری کے لوازم کو اجاگر کرتی ہیں۔ ''دھوپ کے پودے'' کا شاعر لفظوں کی اہمیت اور معیاری شاعری کے تقاضوں کی واقفیت رکھتا ہے اور یہ واقفیت اسے اپنے فنی رویوں کی تشکیل میں تعاون دیتی ہے۔

مجموعے کا نام جس شعر سے مستعار ہے، وہ بھی شاعر کے ذہنی منظرنامے کا تعارف کراتا ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں:

کہاں سے چھاؤں ملے گی ہماری نسلوں کو
زمیں پہ دھوپ کے پودے جو ہم اگاتے رہیں

شعر سے ظاہر ہے کہ شاعر حال کی گود میں پروان چڑھتے ہوئے مستقبل کے لیے کیسی فکر اور کتنا درد رکھتا ہے۔ زمین پر دھوپ کے پودے اگانے کے عمل کو شاعر ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے اور یہ نتیجہ جان کر وہ تڑپ اٹھتا ہے کہ ہماری نسلیں سائے سے محروم رہیں گی یعنی دھوپ میں جھلسنے، جلنے اور مرجھانے

کا دلدوز منظر سامنے آئے گا۔ دھوپ کی منفی صفات سے بیزاری اور چھاؤں کے زندگی بخش پہلوؤں کی طلب دراصل شر اور خیر کے رد و قبول کا مرحلہ ہے۔ ارشد کمال کی نظمیں ہوں یا غزلیں اور ان میں ذاتی واردات کی پیش کش ہو یا بیرون ذات مناظر و احوال کی عکاسی، ہر جگہ شر کو رد اور خیر کو قبول کرنے کی کیفیت نمایاں ہے۔ ہر جگہ شاعر نہ صرف اپنے مافی الضمیر کی آواز سننے کی کوشش کرتا ہے بلکہ وہ اس آواز کو اپنے خون جگر سے موثر و تابناک بنانے کے بلند عزائم و افکار سے بھی سرشار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کے نزدیک ہم کلامی، خودخبری اور خود سے ملاقات ترجیحی امور کی حیثیت رکھتے ہیں:

جسے بھی دیکھو زمانے سے ہے خطاب اس کا
کبھی تو خود سے کوئی ہم کلام ہوجائے
ہمیں ہماری خبر بھی ملا کرے ارشد!
کچھ اپنی زیست کا ایسا نظام ہوجائے
اس نے مجھ کو مجھ سے ملنے کے مواقع کم دیے
زندگی سے بس مجھے اتنا گلہ باقی رہا

''چراغِ شب'' اور ''کشتی'' کو اپنی ذات یا ماحول کے استعارے کے طور پر پیش کرتے ہوئے خود احتسابی یا یہ خود اعترافیہ پہلو بھی توجہ کا حامل ہے:

چراغِ شب میں تو جلنے کا حوصلہ ہی نہیں
وہ چاہتا ہے کہ تہمت ہوا کے سر جائے
کشتی کی کج روی پہ کسی کی نظر نہیں
دریا پہ اتہام ہے، یہ کیا مذاق ہے

نظمیں بھی خودکلامی و خود احتسابی کی کیفیات کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ اس ضمن میں ''آدم خاکی''، ''خدشہ''، ''نوائے وقت'' اور ''ٹریجڈی'' جیسی نظمیں بطور خاص پیش کی جاسکتی ہیں:

سخنور ہی اسے پیراہنِ اظہار دیتا ہے
مورخ کیا لکھے اک ساعتِ بیمار کا قصہ

ساعتِ بیمار کے قصے کو پیراہنِ اظہار عطا کرنے والے سخنور یعنی ''دھوپ کے پودے'' کے شاعر ارشد کمال کی شاعری کی تحسین کئی اہل نظر نے کی ہے۔ مظہر امام کو ارشد کمال کی شاعری میں صنف غزل کی بیشتر خصوصیات جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ وہاب اشرفی کو غزلوں کی وارفتگی متاثر کرتی ہے، مظفر حنفی نے غزلوں میں طنز کی زیریں لہر پائی ہے۔ شکیل الرحمٰن کے مطابق اردو غزل کے نئے مزاج کی نمائندگی ہوتی ہے اور کرشن کمار طور شاعر کے تخلیقی دفور کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان آرا کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ارشد کمال کی شاعری خصوصاً غزلوں کا رنگ و بو توجہ طلب اور تاثر انگیز ہے۔

ہم سخن فہم ہیں

مصنف: رفعت سروش

صفحات: 176، سائز ڈیمائی، قیمت: -/200 روپے

ناشر: نورنگ کتاب گھر، D-3،204، سیکٹر-44، نوئیڈا، یو. پی.

مبصر: شاہد الاسلام، G-79، کالندی کنج، سریتا وہار مین روڈ، نئی دہلی-25

''ہم سخن فہم ہیں'' رفعت سروش کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے ہم عصر فنکاروں کی تخلیقی کاوشوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

رفعت سروش اردو شعر و ادب کا ایک معتبر نام ہے، موصوف زود نویس ہیں نثر و نظم دونوں میں کامیابی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پیرانہ سالی کے باوجود ضعف و نقاہت کے سائے سے بھی وہ پوری طرح محفوظ ہیں، جبھی تو ایک کے بعد ایک ان کی کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ 84 سالہ زندگی کی 7 دہائیاں انھوں نے شعر و ادب کی نذر کی ہیں اور نتیجے کے طور پر تیرہ شعری مجموعے اور ان سے کہیں زیادہ مجموعہ ہائے مضامین منظر عام پر آچکے ہیں۔

زیر نظر مجموعے سے قبل رفعت سروش کے مضامین کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں ان میں ''آنسوؤں کے چراغ'' اور ''علم و ادب کے روشن چراغ'' خاصے اہم ہیں۔ ان مجموعوں میں رفعت سروش نے ان مرحومین کی ادبی خدمات کا احاطہ کیا ہے جو ان کے ہم عصر تھے، مگر اب قصۂ ماضی بن گئے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں انھوں نے حاضر کے ان فنکاروں کے چہرے دکھائے ہیں جن میں سے بیشتر عمر کے لحاظ سے ان سے چھوٹے ہیں اور ادبی خدمات میں بھی ان سے پیچھے۔ اچھے لکھنے والوں کے اوصاف کا اعتدال پسندانہ اعتراف بہت کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس صورت حال سے اردو کا ہر فنکار گزرتا رہا ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں خود رفعت سروش بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید ''روشنی کا سفر'' طے کرتے ہوئے ''شعور آگہی'' کا مسلسل نمونہ پیش کرنے والا یہ فنکار ''علم و ادب کے روشن چراغ'' جلاتے رہنے کے باوجود ''کرب تنہائی'' سے دوچار نہ ہوتا اور ''اندھیرے اجالے کے بیچ'' خود اس کی ہشت پہلو شخصیت ''دھندلکے کی زنجیر'' میں جکڑی ہوئی محسوس نہ ہوتی۔

''ہم سخن فہم ہیں'' میں رفعت سروش نے موجودہ زمانے کے چھوٹے بڑے 19 شعرا کی شخصیت اور فن کا احاطہ کیا ہے۔ ان میں بعض تو ایسے بھی ہیں جن کی شعری کاوشوں سے ادب شناسوں کا بڑا حلقہ ناواقف ہے کیونکہ ان کی تخلیقات کا ہنوز نہ تو کوئی مجموعہ شائع ہوا ہے اور نہ ہی قابل لحاظ ادبی رسائل و جرائد میں ان کا کلام نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فنکاروں سے ادبی دنیا کو متعارف کرانا رفعت سروش کے ادبی خلوص کا ہی مظہر کہلائے گا۔ مصنف نے اس مجموعے میں اسعد رضا، بی ایس جین جوہر، پی پی سریواستو رند، تسنیم انصاری،

رہبر جونپوری، ذکی طارق، سید احمد سحر، طارق بالغتی، فصیح اکمل، قمر سنبھلی، کوثر صدیقی، مصحف اقبال توصیفی، منظر بھوپالی، منظر شہاب، منصور عثمانی، مجاہد فراز، نور جہاں ثروت، نسرین نقاش اور ڈاکٹر وقار الحسن کا تعارف بھی پیش کیا ہے اور ان کے فن پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ہر ایک کے مقام و مرتبے کا بھی کسی حد تک تعین کیا ہے۔ مثلاً وہ اسد رضا کے مجموعۂ کلام ''شہر احساس'' کی ورق گردانی کے دوران یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں ــ ''ہمارے جوان رعنا شاعر اسد رضا کے یہاں عشقیہ شاعری کا فقدان ہے۔ اس مجموعے میں مجھے صرف دو شعر ملے جو ان کے رومانی مزاج کی چغلی کھاتے ہیں..... کاش اسد رضا غزل کے لیے اپنا دل کا دریچہ کھولتے۔ غم دوراں تو بہت تفصیلات اور نئے نئے زاویوں سے بیان ہوتا رہا، غم جاناں کی لطافتوں اور دل کی صداقتوں کو بھی اشعار کے پیکر بخشتے۔''

اپنے ہم عمر شاعر پی ایس جین جوہر کی عشقیہ شاعری سے حظ اٹھاتے ہوئے رفعت سروش جھوم اٹھتے ہیں:

ترا حسن کافرانہ، مرا عشق والہانہ
نہ تجھے خبر تھی اپنی، نہ مرا کوئی ٹھکانہ
مجھے دیکھ کر کسی کا سر راہ مسکرانا
یہی بات تھی ذرا سی یونہی بن گئی فسانہ

بی پی سریواستو رند کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ رند کی غزلیں طلسماتی فضا میں داخل ہوگئی ہیں۔ وہ ایک انجان منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔

تسنیم انصاری کے شعر:

تنہائی کے کرب سے جشنِ عشرت تک
وقت صلیب و دار بدلتا رہتا ہے

کو زندگی کے نشیب و فراز پر بلیغ تبصرہ قرار دیتے ہوئے رفعت سروش نے انصاری کے کلام سے اب تک کی محرومی پر اظہار تاسف ضروری سمجھا۔ وہ رقم طراز ہیں: ''تسنیم کا کلام آج سے پہلے نہیں پڑھا اور پڑھتا بھی کیسے؟ نہ تو ہنوز ان کا کوئی مجموعۂ کلام شائع ہوا اور نہ کسی قابل ذکر ادبی رسالے میں ان کا کلام میری نظر سے گزرا''۔

رفعت سروش نے ''ہم سخن فہم ہیں'' میں جن شعرا کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ ان میں سے بیشتر کے تعلق سے یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی اپنی شاعری کے لحاظ سے شناخت تو ضرور رکھتے ہیں لیکن ناقدین ادب کی توجہ سے ہنوز محروم ہیں۔ منظر شہاب موضوع گفتگو ہوں، نور جہاں ثروت کی شاعری کا قصہ ہو یا نسرین نقاش کی فنکاری کا بیان، سروش ہر جگہ اعتدال پسندانہ طریقے سے محاسن و معائب تلاش کرتے ہیں۔ انھوں نے ہم عصر عزیزوں کو جائز مقام و مرتبہ بخشنے میں کوئی کمی باقی نہیں چھوڑی ہے۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے اور قیمت مناسب، البتہ بعض مقامات پر کمپوزنگ کی غلطیاں بدحظ کرتی ہیں۔

●(یہ تبصرہ رفعت سروش صاحب کی زندگی میں لکھا جاچکا تھا)

گل نا آشنا

مصنف: نور پرکار

صفحات: 366، قیمت:-/25 روپے

ناشر: قلم پبلی کیشنز، ممبئی

مبصر: خان احمد فاروق، حلیم مسلم پی جی کالج، کانپور

نور پرکار اسم با مسمیٰ ہیں۔ ان کے نام کا پہلا حصہ ''نور'' تو روشنی کا مرادف ہی ہے اور لاحقہ ''پرکار'' بھی ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ ''پرکار'' کے اول حرف کو بفتح پڑھیں تو ہندی کا لفظ بنتا ہے جس کے ایک معنی خوبی اور خاصیت کے بھی ہیں اور مضموم پڑھیں تو فارسی کا لفظ بنتا ہے جس کے معنی دانا اور ہشیار کے بھی ہیں۔ نامانوس زمینوں میں دوسری زبان کا بیج لگانا ہشیاری اور دانائی کا کام ہے اور یہ خوبی ہر ایک میں نہیں ہوتی، اور محنت اور وقت دونوں رائیگاں جاتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''گل نا آشنا'' نور پرکار کے ان کالموں کا مجموعہ ہے جو وہ سرزمین کویت میں اردو زبان کی آبیاری اور وہاں اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی تربیت کے لیے اردو روزنامہ ''کویت ٹائمز'' میں ''شاعر بہ نگاہ شاعر'' کے عنوان سے لکھتے رہے۔ یہ کالم وہاں خاصہ مقبول رہا۔

کتاب میں ساٹھ سے زیادہ مختصر مضامین ہیں جن میں بیشتر ہند و پاک کے وہ شاعر ہیں جو کویت میں مقیم ہیں۔ بعض مضامین ایسے شعرا پر بھی ہیں جو استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں اختر انصاری، اکبر الہٰ آبادی، انشا اللہ انشا، چراغ حسن حسرت، سرور جہان آبادی، شاد عارفی، شیخ محمد ابراہیم ذوق، علی جواد زیدی، مخمور دہلوی، مرزا محمد رفیع سودا، مظفر حنفی، مظہر امام، ناصر کاظمی، نظیر اکبرآبادی، والی آسی، وزیر آغا شامل ہیں۔ ان ناموں کی مناسبت سے کتاب کا نام ''گل نا آشنا'' محل نظر ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے نامانوس ناموں کی وجہ سے یہ نام رکھا گیا ہو یا محض نام کے لیے۔ ان مضامین سے مصنف کے وسیع مطالعے کے ساتھ اردو کے لیے اس کا انہماک والہانہ پن، خلوص اور گرویدگی بھی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ ان مضامین کے لکھنے کا مقصد اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کا حلقہ وسیع کرنا تھا۔ اس لیے تحریر میں بھی شاعرانہ انداز پیدا کیا گیا تاکہ ان مضامین کے تئیں لوگوں میں دلچسپی پیدا ہو اور قاری کو ان مستقل کالموں کی طرف راجع کیا جاسکے۔ کتاب کی بعض آرا سے اختلافات کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے صرف نظر کرتے ہوئے نور پرکار جیسے لوگوں کے خلوص پر توجہ کرنی چاہیے جو دامے، درمے، قدمے، سخنے اردو کی خدمت کرنے میں

معروف ہیں۔ ممکن ہے کسی خاص ادبی فہرست میں ان کا نام شامل کیا جائے لیکن یہ جذبہ چراغ سے چراغ جلانے میں ضرور مددگار ہوگا۔ نور پرکار کا پُرکشش اور معروضی انداز بیان قاری کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہے۔

منعکس (نظمیں)

مترجم: ف.س. اعجاز

صفحات: 166، قیمت: -/160 روپے

ناشر: انشاء پبلی کیشنز، B-25، ذکریا اسٹریٹ، کولکاتا-700073

ف.س. اعجاز کی یہ کتاب 94 متنوع نظموں کے اردو ترجمے پر مشتمل ہے۔ ماہنامہ ''انشاء'' کے مدیر ف.س. اعجاز نہ صرف ایک سرگرم صحافی ہیں بلکہ ادب میں شاعری، افسانہ نگاری، تنقید اور ترجمے میں بھی انھیں اچھی مہارت ہے۔ ترجمے کے فن پر ان کے مضامین بھی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو خود تخلیق کار بھی ہو اور مترجم بھی اس کے ترجمے کی اہمیت دو چند ہوجاتی ہے کیوں کہ تخلیقی تجربات اور لفظی کائنات کی باریکی کو وہ خوب محسوس کرتا ہے اور پھر اصل متن کے ساتھ ذہنی و جذباتی سفر کرکے اپنے ترجمے کو تخلیق کا رنگ دے دیتا ہے۔ ف.س. اعجاز نے ولیم شیکسپیئر، الکساندر بلوک، آئی ہورمراتوف، طلیم کیشوکوف، ٹی ایس ایلیٹ، پابلونرودا، محمود درویش، سمیع القاسم، گیتانجلی اور سمیر مکھرجی جیسے 28 شعرا کی تخلیقات کا انگریزی متن سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ نظموں کے یہ ترجمے ''انشا'' میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں لیکن بہ اہتمام انھیں کتابی شکل دی گئی ہے۔ امید کہ اس ترجمے کا پُرکیف رومانی اور انقلابی آہنگ قارئین میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کرے گا۔

انحراف و اعتراف/ ڈاکٹر افضال عاقل

صفحات: 108، قیمت: -/80 روپے

پتہ: 72 مسلمان پاڑہ روڈ، کاشانۂ حسین، کاردلیا، شمالی 24 پرگنہ، مغربی بنگال

افضال عاقل کی یہ کتاب تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل مذہب، شاعری اور تنقید پر ان کی چار کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ ان کی پانچویں تصنیف ہے جس میں 12 مضامین شامل ہیں۔ چھ مضامین شخصی نوعیت کے اور چھ تنقیدی، جن میں بنگال کی تنقیدی فضا، ادب اطفال (مغربی بنگال کے حوالے سے)، ''بنگال کی شاعرات''، ''نئی صدی کا انسان اور اس کا ادب''، ''آسنسول کا افسانوی منظر نامہ'' اور شخصیات میں مولانا ابوالکلام آزاد، مظفر حنفی، کلیم حاذق اور ارمان شام نگری پر مختلف زاویوں سے لکھے گئے مضامین ہیں۔ ابتدائی صفحات میں مصنف کا ''حرفے چند'' (4 صفحات) کے علاوہ اس کتاب پر ڈاکٹر محبوب راہی، ڈاکٹر محمد شاہد اختر اور ڈاکٹر عاصم شہواز شبلی کے تاثرات (10 صفحات) بھی شامل ہیں۔

توشۂ آخرت/ حمید ویشالوی

مرتب: ظفر انصاری ظفر

صفحات: 178، قیمت: ندارد

ناشر: نعت مرکز، پٹنہ بک سینٹر، بی.ایم.داس روڈ، پٹنہ-800004

''توشۂ آخرت'' حمید ویشالوی کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ ظفر انصاری ظفر نے اپنے استاد جناب حمید ویشالوی کے منتشر نعتیہ کلام کا انتخاب استاد کی وفات کے بعد ان کی تسکین روح کے لیے شائع کیا ہے۔ حمید ویشالوی ایک کہنہ مشق شاعر تھے لیکن مفلوک الحالی کی وجہ سے اپنی زندگی میں کوئی مجموعہ شائع نہ کرسکے۔ اب ان کے شاگرد یکے بعد دیگرے ان کا کلام جمع کر رہے ہیں۔

ہر دور میں اردو نعت گو شعرا اپنے کلام کی سحر آفرینی سے دلوں کو مسخر کرتے رہے ہیں۔ اس سیاق میں حمید ویشالوی کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو وہ چشمۂ نور میں غوطہ زن ہوکر اشعار کی تخلیق کرتے ہیں۔ نعت شعرا سے بہت احتیاط کی متقاضی ہوتی ہے کہ ذرا سی لغزش شرک سے ہمکنار کردیتی ہے۔ حمید ویشالوی اس تہذیب و احتیاط سے بہ خوبی واقف ہیں۔ ان کی نعتیہ شاعری میں محبت و شریعت کے درمیان اعتدال و توازن ہے۔ حمید ویشالوی صوفی منش تھے۔ ان کے بیشتر اشعار قرآن و حدیث کی شرح ہیں جنھیں موصوف نے شگفتہ زمینوں اور مترنم بحور کا پیرہن عطا کیا ہے۔

اس مجموعے میں ایک حمد اور تین مناجاتوں کے ساتھ غزل کی ہیئت میں 158، نظم کی ہیئت میں 6 اور قطعات کی ہیئت میں 16 نعتیہ تخلیقات شامل ہیں۔ ابتدائی صفحات میں مرتب کے ''معروضات'' کے علاوہ مولانا حسن رضا خاں اور پروفیسر اختر الواسع کا اس مجموعے پر تاثر بھی شامل ہے۔

سرخاب کے پر/ ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

صفحات: 84، قیمت: -/50 روپے

ناشر: ماریہ ارم، ساجد اردو پریس، مومن پورہ، اکولہ، مہاراشٹر

''سرخاب کے پر'' شیخ رحمٰن کے دس انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ انشائیوں کے عنوانات بالترتیب — اسپتال، سوال، خود پرستی، قینچی، سلام، کتے، ٹوپی، انگلی سے پہنچے تک، کلام میں تکیہ، مشاعرے، ماضی، حال، مستقبل، ہیں۔ شیخ رحمٰن انشائیہ نگاری کے فن سے واقف ہیں۔ ان کے انشائیوں کے ابتدائی الفاظ — ''انسان کی ابتدا اور انتہا اسپتال ہے''، ''تخلیق کائنات کا خیال ہی اوّلین سوال تھا''، ''کتے دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک پالتو، دوسرے فالتو''، ''اور بجنل شعرا، ناقدین اور اناؤنسروں سے معذرت کے ساتھ'' ایسے ہیں جو قاری کو فوراً مطالعے پر آمادہ کرتے ہیں۔ موصوف کے اس نوع کے تین دیگر مجموعوں کے علاوہ بچوں کے لیے کہانیوں کے دو مجموعے اور ایک افسانوی مجموعہ بھی شائع ہوچکا ہے۔ ان کا تحقیقی مقالہ بھی طنز و مزاح سے متعلق ہی ہے جس سے ان کی افتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان کی تحریروں کو

''باوقار انشائیہ نگاری میں اضافہ'' کہا ہے۔

فرشتے کہاں ہیں/ ایم. مصطفےٰ

صفحات: 96، قیمت:-/100 روپے

ناشر: مصنف، گولاڑی پریس روڈ، موتی ہاری-845401

''فرشتے کہاں ہیں؟'' مختلف نثری تحریروں کا مجموعہ ہے جو کل چودہ عنوانات ـــ چند نامہ اکیسویں صدی، کون، سکھی رام دکھی رام، ایسا بھی ہوا، پہچان پتر، میلے جو کم نہ ہوں گے، گلیاں کیسی کیسی، موتگ پھلی کے سنگ، آدھا ادھر آدھا ادھر، جھینگر نے بلایا، گم نام نامہ (1-2)، کیا بولوں کیا نہ بولوں، کون سا دروازہ، پر مشتمل ہے۔ صنف کے اعتبار سے یہ تحریریں کیا ہیں، مصنف بتانے سے قاصر ہے اور صرف اتنا کہتا ہے کہ ''میرا تخلیقی ادب عصر حاضر کے لیے ہے، اس میں منہ بولتی تصویریں ہیں، سچ سارے حروف ہیں، میں اپنے مشاہدوں تجربوں میں کہیں نہ کہیں کسی روپ میں موجود ہوں۔'' ابتدا میں مصنف کی اپنی روداد کے علاوہ پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر قمر اعظم ہاشمی اور جناب شفیع مشہدی کے تاثرات بھی ہیں جن میں ان تحریروں کو مضمون، انشائیے اور افسانوں سے مماثل قرار دیا گیا ہے اور مصنف کے تخلیقی جوہر اور مشاہدات کو سراہا گیا ہے۔

روشنی کے دروازے/ نثار راہی

صفحات: 144، قیمت:-/125 روپے

ناشر: شاعر، کھاٹو محلہ، یتیم خانے کے پاس، جودھپور، راجستھان

''روشنی کے دروازے'' نثار راہی کا شعری مجموعہ ہے جس میں حمد، نعت اور دعا کے بعد 62 غزلیں، 25 نظمیں 50 دوہے اور 4 ماہیے شامل ہیں۔ نثار راہی کو شاعری اپنے والد اے. ڈی. راہی سے ورثے میں ملی ہے اور اپنے نام کے ساتھ راہی اسی مناسبت سے لکھتے ہیں۔ شاعری میں پختہ کار شاعر شین کاف نظام سے انھیں شرف تلمذ حاصل ہے۔ علاوہ اس کے راجستھان کے کئی کہنہ مشق شاعروں کی صحبت سے استفادہ کیا ہے۔ شاعری کو احساس و جذبات کی ترجمانی تسلیم کرتے ہوئے نثار راہی کسی پابندی کے قائل نہیں۔ ماحول اور مسائل کو صدق دلی کے ساتھ لفظوں کے پیکر میں ڈھالنے کے قائل ہیں۔ ان کی شاعری میں جستجو اور لفظ و معنی کے رشتوں کی شناخت کا احساس قاری کی دلچسپی کا اصل محور ہے۔ جناب مخمور سعیدی نے ''حرفے چند'' میں لکھا ہے: ''یہی غزلیں شاعر کی داخلی دنیا کی بھی عکاس ہیں اور ان میں اس خارجی ماحول کی جھلکیاں بھی ہیں جن میں شاعر اپنی کھلی آنکھوں کے ساتھ جی رہا ہے... ان کی نظموں میں پر معنی منظر نگاری یا خارجی ماحول کو داخلی کیفیات سے ہم رشتہ کردینے کا جو سلیقہ ہے وہ ان کے ہم عمر شاعروں میں کم کم ہی کہیں دیکھنے کو ملے گا۔''

نثار راہی کے دوہوں اور ماہیوں سے اپنی مٹی کی سگندھ آتی ہے اور بقول وارث علوی ''یہ سگندھ شدید تر ہے''۔ یہ ایسا ماحولیاتی احساس ہے جس کا رشتہ فطرت سے جاملتا ہے۔ نثار راہی کے اس شعری انتخاب کے ابتدائی صفحات میں وارث علوی، مخمور سعیدی اور زماں آزردہ کے تاثرات اور بیک ٹائٹل پر شاہد عزیز، خوشتر مکرانوی اور ارشد عبدالحمید کے تاثرات بھی ہیں۔ کتاب کی بائنڈنگ اور کاغذ دیدہ زیب ہیں۔

(ادارہ)

□□□

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح

مرتب: ابوالکلام قاسمی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قومی اردو کونسل کی سلسلۂ اشاعت ''بھارت بھارتی سریز'' کے تحت آزادی سے تقریباً ربع صدی قبل سے نصف صدی بعد تک کے معتبر طنزیہ و مزاحیہ مضمون نگاروں کو اس کتاب میں یکجا کیا ہے، جن میں انجم مانپوری، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، حسنین عظیم آبادی، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، شفیقہ فرحت اور اعجاز علی ارشد جیسے پچیس قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ یہ انتخاب آزادی کے بعد لکھے جانے والے مزاحیہ ادبی سرمایے کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس کے حوالے سے اس کے ارتقائی منازل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ متن اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں ہیں اور ساتھ میں مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کردیے گئے ہیں۔

صفحات: 655، قیمت-/457 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

عبدالرحیم نشتر

اٹھو، اٹھو، سویرا ہوگیا

چاروں طرف گہری کالی رات پھیلی ہوئی تھی۔ میدان، جنگل، پہاڑ سب کے سب اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ چرند، پرند، جانور اور انسان اپنے اپنے گھروں میں سوئے پڑے تھے۔ اچانک آسمان کے مشرقی گوشے میں ایک سفیدی سی چمک اٹھی اور سورج نے آہستہ آہستہ اپنا سر ابھارا۔ دور دور تک کرنیں لہرانے لگیں۔

اندھیرا پھیکا پڑنے لگا تو شفق پھوٹ پڑی۔ اب تو آسمان کے مشرقی گوشے کا روپ ہی نرالا تھا۔ شفق کے چمکتے رنگوں کا ہار پہنے ہوئے سورج نے سر اٹھا کر زمین کی طرف دیکھا۔ سورج کے نکلتے ہی کالی رات نے اپنا بوریا بستر باندھا اور روشنی سے ڈر کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ رات کبھی بھی روشنی کے سامنے نہیں ٹک سکتی۔

سورج نے مسکرا کر ندی اور دریا کی طرف دیکھا تو پانی کی رنگت سنہری ہوگئی جیسے سورج نے پانی پر سونے کی چادر بچھا دی ہو یا جیسے دونوں کناروں کے بیچ سونا بکھر گیا ہو۔ یہ منظر دیکھ کر پرندے چہچہانے لگے۔

''اٹھو، اٹھو، سویرا ہوگیا۔'' پانی کی لہروں نے کہا اور آگے کی طرف دوڑ پڑیں۔

''اٹھو، اٹھو، سویرا ہوگیا۔'' مچھلیوں نے کہا اور پانی میں تیرنے لگیں۔

''اٹھو، اٹھو، سویرا ہوگیا۔'' مچھیروں نے کہا اور وہ اپنے جال اور ناؤ لے کر پانی میں اتر گئے۔

''اٹھو، اٹھو، سویرا ہوگیا۔'' پرندوں نے کہا اور اپنے پروں کو تولتے ہوئے کہیں دور نکل گئے روزی کی تلاش میں!

''اٹھو، اٹھو، سویرا ہوگیا۔'' شیر، چیتے، ہاتھی، گھوڑے، ہرن اور دوسرے تمام جانور جاگ اٹھے اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔

سورج کے طلوع ہوتے ہی ساری دنیا جاگ اٹھتی ہے۔ ہر طرف روشنی پھیل جاتی ہے۔ روشنی کے پھیلتے ہی اندھیرے چھٹ جاتے ہیں — یہ صبح کی روشنی ہے۔ ہر رات کے بعد صبح نمودار ہوتی ہے یہ قدرت کا نظام ہے۔ جو لوگ صبح سویرے جاگتے

ہیں، ان کے لیے صبح کی روشنی بڑا انعام ہے۔ صبح سویرے جاگنے والوں کو اللہ تعالیٰ روزی عطا فرماتا ہے۔ ان کے رزق میں برکت دیتا ہے۔

صبح سویرے جاگنے والے تندرست اور صحت مند رہتے ہیں۔ صبح کی سیر کرنے والے جلدی بیمار نہیں پڑتے۔ وہ دن بھر چست رہتے ہیں۔ انھیں سستی اور کاہلی نہیں گھیرتی۔ صبح کی تازہ تازہ، صاف ستھری اور پاکیزہ ہواؤں کے جھونکے صورت ہی نہیں، سیرت بھی نکھار دیتے ہیں۔

صبح کی بڑی برکتیں ہیں مگر یہ برکتیں دیر تک سونے والوں کو نہیں ملتیں۔ ہر صبح نمودار ہوتے ہی آواز لگاتی ہے۔ ''اے سونے والو! اٹھ جاؤ۔ اپنے رب کا نام لو اور اپنے کاموں سے لگ جاؤ۔ حرکت ہی میں برکت ہے۔ جاگنے والے کامیاب اور خوش رہیں گے۔ سونے والے ناکام اور مایوس ہوں گے۔ میں صبح ہوں میرے ساتھ جاگو اور آگے بڑھو۔ میں روشنی لے کر آئی ہوں۔ میرے اجالے کی قدر کرو گے تو زندگی روشنی اور خوشی سے بھر جائے گی۔ میری ناقدری کرو گے تو اندھیرے میں ٹھوکریں کھاؤ گے۔''

زمین جاگی، زمین پر پہاڑ، جنگل اور دریا جاگے، چرند، پرند، جانور اور کیڑے مکوڑے جاگے۔ جس نے صبح کی آواز سنی وہ جاگا اور تیزی سے بھاگا — ترقی کی طرف — زندگی کی طرف — خوشی کی طرف۔ خوش حالی کی طرف —!

اٹھو، اٹھو، سویرا ہو گیا۔

□□□

پتہ:
Saudabi Apartment, A-9,
Goregaon-Raigad-402103 (M.S.)

محمد عبداللطیف

نوبل انعام پانے والے ہندوستانی

پدم شری، پدم بھوشن، پدم وبھوشن اور بھارت رتن جیسے اعزاز کسی بھی ہندوستانی شہری کو، زندگی کے کسی خاص شعبے میں اس کی نمایاں خدمات کے صلے میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ''بھارت رتن'' ہندوستان کا اعلیٰ ترین اعزاز اور خطاب ہے۔

نوبل انعام ایک بین الاقوامی انعام ہے۔ یہ دنیا کے کسی بھی شخص یا ادارے کو زندگی کے کسی خاص میدان میں نمایاں خدمات کے لیے عطا کیا جاتا ہے۔

نوبل انعام، ایک غیر سرکاری تنظیم، نوبل فاؤنڈیشن کی جانب سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ فاؤنڈیشن ایک بین الاقوامی ادارہ ہے اور سویڈن میں قائم ہے۔ یہ ادارہ دنیا کی تمام حکومتوں کی طرف سے تسلیم شدہ ہے۔

نوبل فاؤنڈیشن مشہور سائنس داں نوبل نے قائم کیا تھا اسی لیے یہ اسی کے نام سے منسوب ہے۔ نوبل کا پورا نام الفریڈ برنارڈ نوبل تھا۔ وہ 21 اکتوبر 1833 کو اسٹاک ہوم کے قریب ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ والد کا نام امیانوبل، پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا۔ الفریڈ نوبل ماہر حیاتیات رولف رڈبینک کا نواسا تھا جو ایک ماہرِ علمِ کیمیا، صنعت کار اور انجینئر تھا۔

ڈائنامائیٹ، نائٹروگلیسرین، جیلاٹین، بیالسٹائٹ جیسی چیزیں نوبل کی ایجادات میں شامل ہیں جن کا استعمال کان کنی اور پتھروں کو توڑنے پھوڑنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ نوبل کو ادب اور شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔

نوبل انعام فزکس، کیمسٹری، میڈیسن، ادب، امن، معاشیات اور لیڈر شپ کے لیے دیا جاتا ہے۔ 1968 تک یہ انعام فزکس، کیمسٹری، میڈیسن، ادب اور امن کے لیے دیے جاتے تھے۔ اس کے بعد معاشیات اور لیڈر شپ کے لیے بھی یہ انعام دیا جانے لگا۔

10 دسمبر 1901 کو الفریڈ برنارڈ نوبل کی پانچویں برسی کے موقعے پر پہلی دفعہ یہ انعام دیا گیا۔ تب سے ہر سال 10 دسمبر کو ہی یہ انعامات پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ تمام انعامات اسٹاک ہوم میں ایک تہنیتی جلسے میں پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن امن کے لیے یہ انعام اوسلو میں پیش کیا جاتا ہے۔ نوبل انعام میں ایک گولڈ میڈل، توصیف نامہ جس میں اس شخص یا ادارے کی

خدمات کا ذکر کیا جاتا ہے اور فاؤنڈیشن کی آمدنی کے مطابق نقد رقم سے نوازا جاتا ہے۔ یہ انعام پانے والوں کو نوبل لاریئٹ (Nobel Laureate) کے خطاب سے یاد رکھا جاتا ہے۔

ہندوستان کی جن شخصیات نے یہ انعام حاصل کیا ہے وہ مندرجۂ ذیل ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور (7 مئی 1861-17 اگست 1941): ٹیگور بہ حیثیت شاعر، ناول نگار، فلاسفر، آرٹسٹ اور ماہرِ تعلیم ممتاز ہیں۔ ہمارا قومی ترانہ (جنا گنا منا) انھی کا لکھا ہوا ہے۔ اس لیے انھیں ہندوستان کی تاریخ میں کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ انھیں ان کی مشہور کتاب ''گیتا نجلی'' کے لیے 1913 میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ ٹیگور ہندوستان کے پہلے شخص تھے جنھیں یہ انعام ملا۔ انھوں نے یہ کتاب بنگالی زبان میں لکھی تھی پھر خود ہی اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔

سر سی وی رمن (17 نومبر 1888-21 نومبر 1970): سر سی.وی.رمن ہندوستان کے پہلے سائنس داں ہیں جنھیں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ انھیں یہ انعام ''رمن ایفکٹ'' کے لیے 1930 میں دیا گیا۔ سر رمن 1934 میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس (Indian Institute of Science) بنگلور کے ڈائرکٹر رہے۔ انھوں نے 1948 میں ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جو آج رمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے ہندوستانی حکومت نے انھیں 1954 میں ہندوستان کے سب سے اعلیٰ اعزاز ''بھارت رتن'' سے سرفراز کیا۔

ہرگووند کھورانہ (9 جنوری 1922): ہرگووند کھورانہ کی پیدائش رائے پور (موجودہ پاکستان کا حصہ) میں ہوئی۔ انھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیور پول یونیورسٹی سے حاصل کی۔ سائنس کی دنیا میں ان کا اصل کام جینس (Genes) پر تحقیق ہے۔ اسی تحقیق کی بنیاد پر انھیں 1968 میں میڈیسن میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے لیے مارشل ڈبلیو نیرن برگ اور رابرٹ ڈبلیو ہو سے کے ساتھ نوبل انعام دیا گیا۔

مدر ٹریسا (27 اگست 1910-5 ستمبر 1997): مدر ٹریسا کو انسانیت کی بہبودی کی خدمات کے لیے 1979 میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ مدر ٹریسا ایک ایسا نام ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ نوبل انعام کے علاوہ انھوں

نے 1971 میں Pop John XXII Peace Price، 1973 میں Templetor Price، 1985 میں Presidential Medal of Freedom، 1996 میں Honorary Citizen of the United State جیسے اعزازات اور خطابات پائے۔ مدر ٹریسا کو "انجیل آف مرسی" (Angle of Mercy) کہا جاتا ہے۔

ایس چندر شیکھر (19 اکتوبر 1910): چندر شیکھر 19 اکتوبر 1910 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ پریسیڈینسی کالج، مدراس سے 1930 میں B.Sc. کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد حکومتِ ہند کی طرف سے اسکالرشپ حاصل کر کے پوسٹ گریجویٹ کی ڈگری کیمبرج یونیورسٹی سے 1933 میں حاصل کی۔ پھر شکاگو یونیورسٹی کے Research Associate رہے۔ انھیں 1983 میں فزکس میں ان کے ورک "Evolution of Stars" کے لیے نوبل انعام دیا گیا۔

ڈاکٹر امرتا سین (3 نومبر 1933): ڈاکٹر امرتا سین کی پیدائش شانتی نکیتن، مغربی بنگال میں ہوئی۔ انھیں 1998 میں معاشیات کے شعبے میں نمایاں کام کے لیے نوبل انعام دیا گیا۔ حکومت ہند نے بھی 1999 میں معاشیات میں ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے "بھارت رتن" انعام عطا کیا۔

ڈاکٹر راجندر کمار پچوری (20 اگست 1940): ڈاکٹر آر. کے. پچوری کی پیدائش نینی تال میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ سے حاصل کی۔ 1972 میں North Carolina State University, USA سے انڈسٹریل انجینئرنگ میں Ph.D. اور معاشیات میں بھی Ph.D. کیا۔ حکومت ہند نے انھیں 2001 میں پدم بھوشن ایوارڈ سے نوازا۔ ڈاکٹر آر. کے. پچوری کو امن کے لیے 2007 میں البرٹ ارنلڈ کے ساتھ نوبل انعام دیا گیا۔

□□□

پتہ:
H.No.6-17, Deshmukh Street,
Basavakalyan, Dist. Bidar,
Karnataka State-585327

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری

قومی اردو کونسل کی مندرجۂ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جاسکتی ہیں

اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی	52.00	13.00
02	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	123.00	31.00
03	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
04	عہدِ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
05	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
06	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
07	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
08	برقی توانائی	94.00	24.00
09	بھارت 2001	250.00	63.00
10	بھارت 2002	250.00	63.00
11	چولا راجگان	209.00	52.00
12	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے	69.00	17.00
13	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
14	فیودر دستوئیفسکی	52.00	13.00
15	غرائب الجمل	76.00	19.00
16	گلشنِ بے خار	128.00	32.00
17	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
18	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
19	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
20	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
21	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
22	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
23	ہندوستانی مصوری عہدِ مغلیہ میں	158.00	40.00
24	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
25	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
26	ابتدائی علمِ شہریت	47.00	12.00
27	انسانی ارتقا	70.00	18.00
28	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00

850.00	3400.00	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد۔6-1)	29
448.00	1790.00	جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد۔4-1 اور 8-6)	30
45.00	180.00	جنت سنگار	31
1018.00	4071	کلیات پریم چند (جلد 1 تا 24)	32
18.00	72.00	للو لال جی ایک ادبی سوانح	33
97.00	387.00	لغت ابجد شاری (جلد۔1، حصہ دوم)	34
		لغت ابجد شاری (جلد۔2، حصہ اول و دوم)	
67.00	268.00	مجموعہ نغز	35
32.00	126.00	مسدود راہیں	36
17.00	66.00	مثنوی بہرام وگل اندام	37
14.00	57.00	مولیئر	38
23.00	92.00	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	39
39.00	157.00	اڑیسہ میں اردو	40
15.00	60.00	پشکن	41
21.00	82.00	قدیم ہندی فلسفہ	42
21.00	82.00	قدیم ہندوستان میں شودر	43
19.00	76.00	قومی زبان	44
67.00	268.00	قواعد کیٹیلاگ سازی	45
37.00	149.00	صنعتی تنظیم اور انتظام	46
42.00	167.00	سیر کہسار	47
21.00	82.00	طبیعیات کے بنیادی تصورات	48
34.00	135.00	تمل ناڈو میں اردو	49
40.00	158.00	تنقید عقل محض	50
11.00	43.00	تاریخ طبی (جلد۔1)	51
24.00	97.00	تاریخ فلسفہ سیاسیات	52
17.00	66.00	تشریحی تصاویر	53
34.00	136.00	توضیحی لسانیات	54
108.00	431.00	تذکرۂ مخطوطات (جلد۔5-1)	55
11.00	46.00	تالستائے	56
12.00	47.00	اصول معاشیات	57
30.00	120.00	اتر پردیش کے لوک گیت	58
30.00	118.00	وجے نگر کے عہد میں نظام حکومت	59
11.00	45.00	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	60
663.00	2650.00	وضاحتی کتابیات (جلد 1-3-22)	61

62	زراعتی انکشافات	192.00	48.00
63	آسان اردو شارٹ ہینڈ	92.00	23.00
64	عکس اور برعکس	128.00	32.00
65	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	52.00	13.00
66	بھارت 2004	250.00	63.00
67	دھوپ چولھا	38.00	10.00
68	اجارہ	131.00	33.00
69	فسانہ آزاد جلد 1 تا 4	1163.00	291.00
70	ہندوستانی سرزمین اور عوام	30.00	08.00
71	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	130.00	33.00
72	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	188.00	47.00
73	ابتدائی سماجیات	43.00	11.00
74	ارتقائے کائنات انسان و دیگر مضامین	94.00	24.00
75	جدید ابتدائی منطق	57.00	14.00
76	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	114.00	29.00
77	کائنات جلیل	80.00	20.00
78	کتب خانہ داری ایک تعارف	108.00	27.00
79	معاشیات کے بنیادی اصول	82.00	21.00
80	مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت	82.00	21.00
81	پیمائش ونقشہ کشی	85.00	21.00
82	قدیم ہندوستان کی تاریخ	114.00	29.00
83	قدیم تامل ناڈو میں عربی و فارسی	98.00	25.00
84	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	73.00	18.00
85	شہیدان آزادی (جلد اول و دوم)	213.00	53.00
86	شخصیت کے نظریات	92.00	23.00
87	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	150.00	38.00
88	سخنوران گجرات	77.00	19.00
89	تاریخ ہندی فلسفہ (جلد اول)	89.00	22.00
90	تاریخ آصفی	58.00	15.00
91	اجرتیں	95.00	24.00
92	جدید ہندوستان کے سماجی وسیاسی افکار	178.00	45.00
93	جنوبی ہند کی تاریخ	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2009 تک دی جائے گی۔

نوٹ:۔ محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

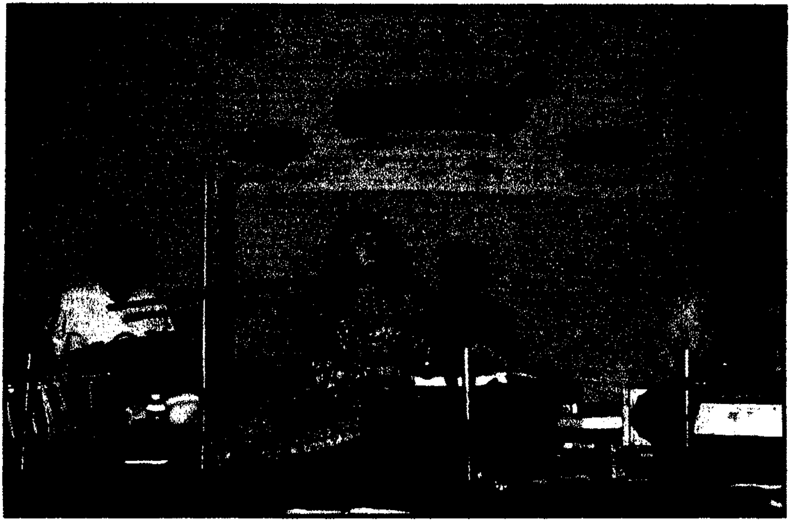

غزل سنگر محترمہ خوشبو خانم اردو کتاب میلے میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی ہیں

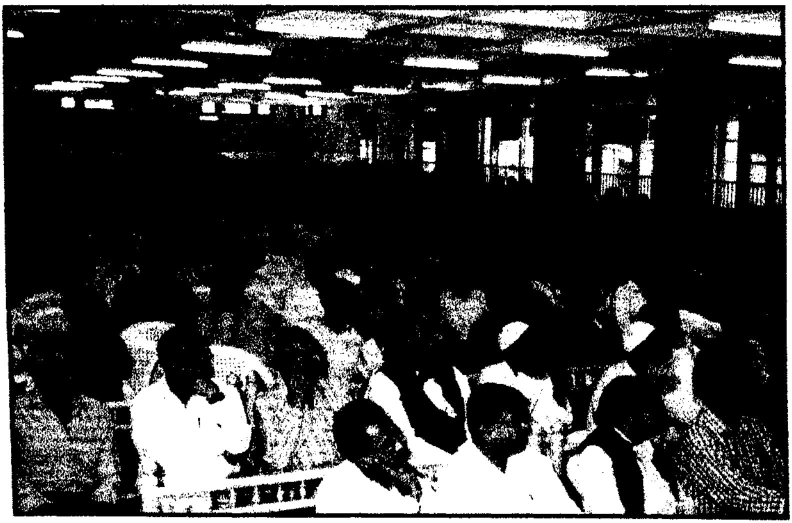

اردو کتاب میلے کے ہر پروگرام میں اردو کے شائقین کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

Date of Publication : 24/02/2009
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, March 2009, Vol. 11, Issue: 3
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

راج اورنگ

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی دکن کا وہ آخری بڑا شاعر ہے جس کی شاعری دکن اور شمال کی زبان کے بیچ احساسِ دوئی کو ختم کرتی ہے۔ انھوں نے چوبیس سال تک کے شعری سفر میں جو کچھ کہا ان میں سے دستیاب شدہ 508 غزلیں، 11 مثنویاں، 9 رباعیاں، ایک قصیدہ، 5 مستزاد، ایک ترجیع بند اور ایک مناجات اس کلیات میں شامل ہیں۔ اردو شعر و ادب میں سراج کی قادر الکلامی مسلم ہے۔ ان کے کلام کا انتخاب اردو دنیا کی تقریباً تمام درس گاہوں کے نصابات میں شامل ہے۔ اس غرض سے قومی اردو کونسل نے ''کلیات سراج'' کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

صفحات: 732، قیمت:- 138/- روپے

ت حسن

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں ''آتش پارے''، ''منٹو کے افسانے'' اور ''دھواں'' کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت:- 285/- روپے

دکنی لغت

مرتب: سیدہ جعفر

دکنی شعر و ادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے، جو اردو زبان و ادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین و ترتیب میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات: 521، قیمت:- 590/- روپے

ے بعد اردو نظم

مرتبین — شمیم حنفی، مظہر مہدی

''آزادی کے بعد اردو نظم'' آزادی کے بعد کی اردو نظموں کا ایک جامع انتخاب ہے جس میں 67 نمائندہ نظم نگاروں کی 245 نظمیں شامل ہیں۔ تمام نظمیں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں پیش کی گئی ہیں اور فٹ نوٹ میں مشکل الفاظ و تراکیب کے معنی بھی دیے گئے ہیں جن سے ہندی اردو کے قارئین ایک ساتھ استفادہ کر سکتے ہیں۔

صفحات: 758، قیمت:- 384/- روپے

اردو لغت

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

ٹیکنک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے ''جدید — ہندی اردو لغت'' اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، مآخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ کاوش ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3286 (دونوں جلدیں)، قیمت- 1640/ روپے (دونوں جلدیں)

راور آتش

مصنف: فضیل جعفری

فضیل جعفری ہمارے عہد کے معتبر ناقد اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ''آبشار اور آتش فشاں'' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں 11 مضامین شامل ہیں۔ ان کی یہ تنقیدی تحریریں ادب پاروں پر نہیں بلکہ اپنے عہد کی تنقیدوں اور نقادوں پر ہیں۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر بہت بحثیں ہوئی ہیں اور تائید و تردید میں مزید تشخیص اور دلائل کا سلسلہ جاری ہے۔ اس بحث کی تفہیم میں فضیل جعفری کی یہ کتاب قاری کے ذہن کو نئی روشنی عطا کرتی ہے۔

صفحات: 368، قیمت:- 160/- روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

Printed and Published by Dr. Abu Bakar Abbad, P. P. O. NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by TNPL Editor: Dr. Abu Bakar Abbad, Tel: 26103381, 26103938